اس عفریت کی کہانی جس کے روئیں روئیں میں ہزاروں اسرار چھپے ہوتے ہیں۔
ریچھ کے اسرار
انوار علیگی

اس عفریت کی کہانی جس کے روئیں روئیں میں ہزاروں اسرار چھپے ہوتے ہیں

انوار علیگ

اسٹاکسٹ :-

مکتبہ القریش سرکلر روڈ

اردو بازار، لاھور-۲

عشق کرنا ہے تو اللہ سے کرو
جو لوگ اللہ سے عشق کرتے ہیں
وہ کبھی رُسوا ہوتے ہیں، نہ ذلیل اور نہ بے سکون

ناشر ——— محمد علی قریشی
مطبع ——— نیر اسد پریس
بار اول ——— مئی 2001ء
تعداد ——— 1100
سرورق ——— انعام راجہ
قیمت ——— 100/روپے

اپنی بات

اکثر پڑھنے والے مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ میں کیسے لکھتا ہوں؟ اصل میں پوچھنے والا یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں یہ عجیب وغریب واقعات کہاں سے ڈھونڈ کر لاتا ہوں؟ کس طرح سوچتا ہوں؟ آیئے! میں آپ کو بتاتا ہوں۔

اس دنیا میں، بلکہ پوری کائنات میں پہلے سے ہر چیز موجود ہے۔ جب کوئی کہتا ہے کہ میں نے یہ چیز تخلیق کی ہے تو وہ غلط کہتا ہے۔ کسی انسان کی بھلا کیا مجال، جو وہ کوئی چیز تخلیق کر سکے۔ خلاّق تو بس اللہ ہے۔ اصل میں جو چیز انسان کے دماغ میں آتی ہے، وہ پہلے سے کہیں موجود ہوتی ہے۔ انسان موجود کو محض کاپی کرتا ہے۔ اصل کی نقل اُتارتا ہے۔ جس طرح ہر ذرّہ، دوسرے ذرّے سے منسلک ہے، ویسے ہی کائنات میں بسنے والی ہر ذی رُوح لاشعوری طور پر ایک ڈوری سے بندھی ہے۔ ہمارے دماغ کا اینٹینا (لاشعور) نئے نئے خیالات فضا سے پکڑتا ہے۔ یہ خیالات لاشعور سے تحت الشعور اور پھر شعور میں آجاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خیال ہم نے تخلیق کیا ہے۔

میں جب لکھنا شروع کرتا ہوں تو سوچ کے پہلے دروازے پر دستک دیتا ہوں۔ بس پھر ایک کے بعد تخیل کے دروازے کھلنا شروع ہو جاتے ہیں اور میں کسی اور دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔ مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو میری آنکھوں کے سامنے سے بہت سے پردے ہٹا دیتی ہے۔ میں وہ کچھ دیکھنے لگتا ہوں، جو ایک عام انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

ناول کے شائع ہونے کے بعد جب میں اُس پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہ ناول اپنا لکھا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس کیفیت میں یہ ناول لکھا گیا ہوتا ہے، اُس سے میں نکل چکا ہوتا ہوں۔

جب میں ناول شروع کرتا ہوں تو میرے ذہن میں مکمل پلاٹ نہیں ہوتا۔ بس! تھوڑا بہت نقشہ ہوتا ہے۔ میں بغیر نقشے کے ''تعمیر'' شروع کر دیتا ہوں۔ دروازے، کھڑکیاں خود بخود نکلتے آتے ہیں اور آہستہ آہستہ پورا محل تعمیر ہو جاتا ہے۔ اور تکمیل کے بعد یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس محل کو نقشے کے بغیر تعمیر کیا گیا ہے۔ میں اصل میں پورا ناول سوچ کر لکھ ہی نہیں سکتا۔ سوچتا جاتا ہوں اور لکھتا جاتا ہوں...... میرا خیال ہے کہ میرے پڑھنے والوں کو تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں کیسے لکھتا ہوں۔

اس ناول کے بارے میں مجھے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ ''ریچھ کے اسرار'' میرا دوسرا ناول ہے۔ اس کا موضوع عورت اور ریچھ ہے۔ ریچھ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ عورت کو بہت پسند کرتا ہے۔ اگر عورت تنہا مل جائے تو وہ اُسے اُٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے جاتا ہے۔ یہ تو رہی ریچھ سے متعلق روایت...... اب کچھ عورت کی دلچسپی کا احوال...... ایک مرتبہ میں نے ایک نوجوان لڑکی کی بنائی ہوئی تصویر دیکھی جو اُس نے اپنے گھر میں آویزاں کر رکھی تھی۔ تصویر میں ایک دیوزاد ریچھ دکھایا گیا تھا۔ اُس ریچھ نے ایک خوبصورت لڑکی کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا ہوا تھا۔ اور دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ لڑکی خوفزدہ ہونے کی بجائے پُرسکون انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ اُس تصویر کو دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ اگر ریچھ، عورت کو پسند کرتا ہے تو عورت بھی ریچھ سے لگاؤ رکھتی ہے۔ گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ بس! اس خیال نے اس ناول کو جنم دیا۔ یہ ناول کیسا ہے؟ اس کا اندازہ آپ کو پڑھ کر ہوگا۔

میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست آصف بلگرامی بھی موجود تھا۔ ندرت' آصف بلگرامی کی دوست تھی۔ جب میں نے آصف سے ندرت کا انٹرویو اور چند تصاویر بنانے کا ذکر کیا تو وہ بلا پس و پیش میرے ساتھ چلنے کیلئے راضی ہو گیا۔

''آصف ایک بینک میں اہم عہدے پر فائز تھا۔ ندرت بھی اسی بینک میں ملازم تھی۔ میں آصف سے ملنے اکثر اس کے بینک جایا کرتا تھا۔ اسی بینک کے باتھ روم میں میری پہلی ملاقات ندرت سے ہوئی تھی۔ چونکنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی میری طرف سے بدگمان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اپنے دل میں کوئی برا خیال لانے کی ضرورت ہے۔ باتھ روم سے نکلنے کے بعد جب میں آصف کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے دیکھ کر حسب معمول ایک نئے لقب سے مخاطب کیا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

''یار یہ ندرت کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

میرا سوال سن کر اس نے چونکنے کی اداکاری کی' پھر کرسی پر بیٹھ کر مسکرایا اور مجھے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''کیا تم باتھ روم سے آ رہے ہو؟''

''ہاں' غلطی آج مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔'' میں نے میز پر کہنیاں جماتے ہوئے کہا۔

''اس دھماکہ خیز تعارف کے بعد تم نے اس لڑکی کے بارے میں کیا رائے قائم کی۔'' آصف نے اپنے سامنے رکھے ہوئے چند کاغذات پر دستخط

کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ممکن تھا کہ باتھ روم کی دیواروں پر لکھی ان گندی تحریروں سے کوئی خراب رائے قائم کر لیتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اس بینک کے صدر دفتر میں ذہنی بیماروں کی کمی نہیں۔''

''ذہنی عیاش کہو۔'' آصف نے غصے سے کہا۔ ''کیسی کیسی شرمناک باتیں لکھی ہوئی ہیں اس غریب کے بارے میں۔ یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں' میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

''اس کے پیچھے مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ صحیح تجزیہ تو کوئی نفسیات داں ہی کر سکتا ہے۔ ویسے میرے خیال میں ایسے لوگ کسی محرومی کا شکار ہوتے ہیں۔ ندرت کو میں نے دیکھا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس دفتر کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔''

''وہ بہت پرکشش لڑکی ہے لیکن تم نے یہ اندازہ کس طرح لگایا۔''

''باتھ روم کی دیواروں پر سب سے زیادہ ذکر اسی لڑکی کا تھا۔ کون ہے یہ لڑکی؟''

''ملو گے اس سے؟'' آصف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں' ایسا کوئی شوق نہیں۔''

''وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ کھری اور صاف۔ اس سے میری دوستی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس سے گھریلو تعلقات ہیں۔ وہ میرے ہاں اور میں اس کے گھر آتا جاتا ہوں۔ ایک اچھی بینک افسر ہونے کے ساتھ گلوکاری سے لگاؤ ہے۔ بہت اچھی آواز ہے' بہت اچھا گاتی ہے۔ تمہاری اس سے ملاقات ہونی چاہیے۔'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''یار تم اپنے پرچے کے لیے اس کا انٹرویو کیوں نہیں کر لیتے۔''

ایک بینک افسر اگر اچھا گاتی ہے تو اسے ہمارا پرچہ انٹرویو کیوں کرے؟

ہمارے پرچے میں نامور گلوکاروں کو ہی جگہ مشکل سے ملتی تھی۔ یہ بات میں آصف کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ خیر! میں نے مروتاً اس سے ملنے اور اس کا انٹرویو چھاپنے کی حامی بھر لی اور یوں بات آئی گئی ہوگئی۔

پھر کوئی پانچ چھ ماہ بعد' میں نے ندرت کو کراچی کے ایک مقامی ہال میں گاتے ہوئے سنا۔ میرے ہمراہ آصف تھا اور وہی مجھے اس راگ رنگ کی محفل میں گھسیٹ کر لایا تھا۔ یہ ندرت سے میری دوسری ملاقات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ندرت کی آواز بہت اچھی تھی۔ داغ کی غزل اس نے خوب گائی۔ میں اس دن اس سے خاصا متاثر ہوا لیکن اتنا متاثر نہیں کہ اپنے پرچے کیلئے اس کا انٹرویو کرنے پہنچ جاؤں۔

اگلے تین چار ماہ میں ایک عجیب لہر آئی۔ ندرت کا ہر محفل میں ذکر ہونے لگا۔ موسیقی کے پروگرام اس کے بغیر سونے لگنے لگے۔ ریڈیو ٹی وی پر اس کا ڈنکا بجنے لگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ندرت نے بہت اچھا گلا پایا تھا لیکن اس کی شہرت میں صرف اس کی آواز کا ہاتھ نہ تھا' کچھ اس کے حسن کی بھی کرشمہ سازی تھی۔ آخر مجھے وہ دن بھی دیکھنا پڑا' جب ہمارے پرچے کے مدیر نے ندرت کا انٹرویو اور تصاویر اتارنے کا حکم صادر فرما دیا۔

تب مجھے آصف کا خیال آیا۔ ساتھ ہی شرم بھی آئی۔ آصف نے تو کتنا عرصہ پہلے اس کا انٹرویو کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے ہی اسے غیر اہم جان کر ٹرخا دیا تھا۔

☆......☆......☆

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو میں اسے پہچان نہ سکا۔ پہلی نظر میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ اس گھر کی ملازمہ ہے اور ندرت کے بارے میں کچھ بتانے آئی ہے لیکن وہ ملازمہ نہ تھی خود ندرت تھی۔ انتہائی معمولی سے کپڑوں میں' بالوں میں گرد' چہرے پر گرد' ہاتھ پاؤں مٹی سے اٹے ہوئے۔

وہ بڑی سادگی سے سلام کر کے میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔
''سو رہی تھیں کیا؟'' آصف نے پوچھا۔
''نہیں بھئی۔ گھر کی صفائی میں لگی ہوئی تھی۔'' ندرت نے سادگی سے
جواب دیا۔
''کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ ہم آنے والے ہیں۔''
''تھا۔'' بڑا مختصر سا جواب۔
''پھر ایسا کریں ذرا جھاڑو اپنے ساتھ لے آئیں اور دو چار تصویریں
جھاڑو دیتے ہوئے اتروائیں۔''
یہ سن کر وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بڑی معصومیت سے آصف کی طرف
دیکھتے ہوئے بولی۔''غصہ کیوں کرتے ہیں مجھے تیار ہونے میں چند منٹ لگیں گے۔
''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ چند منٹ لگتے ہیں یا چند گھنٹے۔''
''آپ آصف کی باتوں پر یقین مت کیجئے گا۔'' ندرت مجھ سے مخاطب
ہو کر بولی۔''میں اندر جا کر چائے بھیجتی ہوں آپ لوگ چائے پئیں اتنی دیر میں
میں تیار ہو کر آئی۔''
اس کے اندر جانے کے بعد اچانک میری نظر اس تصویر پر پڑی۔ وہ
تصویر میری پشت پر تھی اور اپنے ارشاد بھائی اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ ارشاد بھائی
اپنے پرچے کے فوٹو گرافر تھے اور ٹرانسپرنس بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔
تصویر پر نظر پڑتے ہی میرے جسم میں چیونٹیاں سی کاٹنے لگیں۔ میں صوفے سے
اٹھ کر اس تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پورے ڈرائنگ روم میں یہ اکلوتی تصویر
تھی۔ تین فٹ لمبی اور اڑھائی فٹ چوڑی۔ لکڑی کے قیمتی فریم میں مزین۔ روغنی
رنگوں سے بنی اس تصویر میں ایک بہت بڑا ریچھ دکھایا گیا تھا۔ اس ریچھ نے ایک
عورت کو اٹھایا ہوا تھا۔ اس تصویر پر ندرت کے دستخط ثبت تھے۔
ابھی ہم لوگ اس تصویر کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ دروازے میں برتنوں

کی آواز سنائی دی۔ ندرت چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اتنی دیر میں
اس کا چہرہ ڈھل چکا تھا۔ وہ آصف سے چائے بنانے کا کہہ کر فوراً ہی واپس ہو گئی۔
''تصویر دیکھی؟'' آصف مجھ سے مخاطب تھا۔
''بہت اچھی طرح۔''
''کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلے کے۔''
''اس تصویر کو بنا کر بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔''
''صرف بنا کر۔''
''نہیں..... اسے ڈرائنگ روم میں لٹکا کر بھی۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ
لڑکی بڑی صاف اور کھری ہے اس کا ظاہر باطن ایک ہے۔ ایک بات بتاؤ آصف۔
کیا اس گھر میں کوئی مرد نہیں۔ میں نے چائے میں چمچہ چلاتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں، کوئی نہیں۔''
''کیا یہ اکیلی رہتی ہے؟''
''نہیں، چھوٹی بہن اس کے ساتھ رہتی ہے۔''
''یہ شادی کیوں نہیں کرتی۔''
''یہ شادی شدہ ہے۔''
''شادی شدہ؟'' میں چائے پیتے پیتے رک گیا۔
''یہ تو انکشاف ہے میرے لیے۔''
اس شادی کے پیچھے کوئی المیہ؟'' میں نے پیالی منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔
''ندرت کی شادی سترہ سال کی عمر میں اس کی ماں نے ایک ریچھ سے
کر دی تھی۔ یہ ساتھ نبھ نہ سکا جلد ہی اپنے گھر چلی آئی۔
میرے ذہن میں بے شمار سوالوں نے انگڑائیاں لیں۔ میں اس المیہ سے
متعلق ایک سوال اپنے ہونٹوں میں لانا چاہتا ہی تھا کہ ندرت دروازے پر نمودار ہوئی۔
''معاف کیجئے گا میری وجہ سے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔'' وہ

مجھ سے مخاطب تھی

''انتظار کی کیفیت سے تو ابھی ہم لوگ دو چار نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے واقعی کمال کیا۔ اس قدر جلد تیار ہو کر آ گئیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ کی۔ اس کے چہرے پر ماہرانہ میک اپ تھا اور اس نے گلابی رنگ کی ساڑی زیب تن کر رکھی تھی۔ اب وہ واقعی ندرت لگ رہی تھی۔ حسین اور پرکشش۔

''پہلے میں تصویر بنا لوں؟'' ارشاد بھائی کیمرہ سٹینڈ پر لگاتے ہوئے بولے۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ میں چاہ رہا تھا کہ ندرت کی بنائی ہوئی ریچھ کی تصویر بھی کسی طرح ایکسپوز ہو جائے لیکن میں یہ بات ندرت کے ساتھ اپنے فوٹو گرافر سے کہہ نہیں سکتا تھا۔

''آیئے۔'' ارشاد بھائی نے ندرت کو اٹھنے کا شارہ کیا اور انہوں نے ریچھ کی تصویر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے فوٹو گرافر کو داد دی۔

''اس تصویر کے ساتھ آپ کو ایکسپوز کر لیا جائے کوئی حرج تو نہیں۔'' ارشاد بھائی اپنا کیمرہ سیٹ کرتے ہوئے بولے۔

''کر لیجئے ایکسپوز لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ آپ اس تصویر کو چھاپ نہیں سکیں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں کوئی باقاعدہ آرٹسٹ تو ہوں نہیں۔ یہ تصویر ایک طرح سے میرا ذاتی اظہار ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری کوئی ذاتی بات آپ کے پرچے کے قارئین تک پہنچے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری اس خواہش کا احترام کریں گے۔'' ندرت نے بڑے نپے تلے انداز میں کہا۔

ارشاد بھائی نے میری جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے، رہنے دیں۔'' میں نے ان کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیا۔

دو تین لباسوں میں مختلف تصاویر اتروانے کے بعد جب ندرت انٹرویو دینے کیلئے بیٹھی تو میرے جی میں آیا کہ سب سے پہلے اس تصویر کے بارے میں سوال کروں لیکن ایسا میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ پہلے اس سے ادھر ادھر کے

سوال کرتا رہا۔ آخر ایک جگہ موقع غنیمت جان کر میں نے دھیرے سے پانسہ پھینکا۔

''یہ تصویر آپ نے کتنے دن میں مکمل کی؟''

''جی، تین ماہ میں۔'' ندرت نے بڑے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

''آپ اس تصویر میں کیا کہنا چاہتی ہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

میں سمجھ گیا کہ اس نے یہ سوال سوچنے کا وقت لینے کیلئے کیا ہے پھر بھی مجھے اس کا کچھ نہ کچھ جواب تو دینا تھا۔

''مردوں کے بارے میں آپ کا تصور کچھ تلخ معلوم ہوتا ہے۔ آپ انہیں درندہ صفت خیال کرتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

میری بات سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ یہ کچھ عجیب سی ہسٹریائی انداز کی ہنسی تھی اور اس ہنسی میں مجھے نادان تصور کیے جانے کا عنصر غالب تھا۔

میں نے اس کی ہنسی رکنے کا بڑے صبر سے انتظار کیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس نے ہنسنا بند کر کے کوئی بے سر پیر کی بات چھیڑ دی اور اسے اتنی دور جا کر چھوڑا کہ میرے سوال کی خاک بھی باقی نہ رہی۔ اب کیونکہ یہ سوال ذاتی نوعیت کا تھا اس لیے اسے میں نے دوبارہ چھیڑنا اخلاقی نقطہ نظر سے مناسب نہ جانا۔ شاید وہ چاہتی بھی یہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اس کی شادی شدہ زندگی کے بارے میں سوال کرنا چاہا تو اس نے سختی سے روک دیا۔

میں اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ اس کے ذکر ہی سے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔'' وہ انتہائی بیزاری سے بولی۔

دو چار رسمی سوالات کرنے کے بعد ہم نے ندرت سے اجازت چاہی۔ اس نے اٹھتے ہوئے بڑے خلوص سے معافی مانگی اور کہا کہ بعض وقت اس کے اعضاء بے قابو ہو جاتے ہیں اور اس رویے پر بعد میں اسے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔

وہ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئی۔ آصف کو اس نے اصرار کر کے روک لیا۔ اور ارشاد بھائی اپنی گاڑی میں آ بیٹھے۔

''فراڈ۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی ارشاد بھائی نے نعرہ لگایا۔

''کہاں ہے فراڈ؟'' میں نے چاروں طرف دیکھا۔

''ایمان سے یہ لڑکی بڑی فراڈ ہے۔''

''کیسے؟'' میری نگاہوں میں سوال تھا۔

''آپ نے وہ تصویر غور سے دیکھی تھی؟''

''ہاں' دیکھی تھی۔'' میں نے کہا۔

اس عورت کا چہرہ بھی غور سے دیکھا تھا۔''وہ جسے ریچھ نے اٹھایا ہوا تھا'' ارشاد بھائی نے یاد دلایا۔

''کیا تھا اس کے چہرے پر؟'' میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر سکون پھیلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کے جذبات تھے۔ صورتحال نے اسے دہشت زدہ کرنے کی بجائے الفت زدہ بنا دیا تھا۔ خدا کی قسم یہ لڑکی خواہشوں کی ماری ہے۔ انتہائی غیر معمولی خواہشوں کی دلدادہ' ایک دم فراڈ۔'' ارشاد بھائی جوش میں کہتے چلے گئے اور میرے سامنے...... سوچنے کا ایک نیا باب کھل گیا۔

☆......☆......☆

رات تک ندرت کی ہسٹریائی ہنسی میرا پیچھا کرتی رہی۔ اس کی بنائی ہوئی ریچھ کی تصویر۔ بار بار نگاہوں میں گھوما کی۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر جب میں بستر پر لیٹا' تو اس ہولناک واقعے کی جزوئیات میرے ذہن میں تازہ ہونے لگیں۔ ٹنک پور کا وہ پراسرار جنگل' پہاڑی مزدوروں کی وہ جھونپڑیاں' تنگ' اونچے نیچے راستے' بہتے چشمے' اس میں پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھر۔ ان پتھروں پر میرا اکثر بیٹھنا۔ دور پہاڑیوں کو تکنا' حسن فطرت سے محظوظ ہونا' وہ دونالی اسپین ساختہ

بندوق جس کی نالیاں کارتوسوں سے بہت کم ہمکنار ہوئی تھیں' وہ رات کو جنگل کے بیچ پڑاؤ پر سونا' رات بھر آگ کا جلنا اور کسی جنگلی جانور کی آواز پر چونک کر اٹھنا۔ یہ سب باتیں مجھے تیزی سے یاد آ رہی تھیں...... میرے گرد ہجوم کرتی جا رہی تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں علی گڑھ میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ میرے چچا حاجی مردان خاں جو بریلی میں رہائش پذیر تھے اور جو بانسوں کے جنگلات کے بڑے بڑے ٹھیکے لیتے تھے مجھے عرصے سے جنگلات کی زندگی دیکھنے اور شکار کھیلنے کی دعوت دے رہے تھے۔ آخر میں کچھ ان کے بلاوے کے احترام اور کچھ اپنے شوق سے مجبور ہو کر بریلی جانے کیلئے تیار ہو گیا۔

اس وقت علی گڑھ سے بریلی کیلئے دو گاڑیاں چلتی تھیں۔ ایک صبح' ایک شام۔ میں نے شام کی گاڑی کا انتخاب کیا۔ یہ گاڑی صبح تڑکے بریلی پہنچتی تھی۔ رات کا سفر میں آسانی سے سو کر گزار سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اپنے ساتھ بندوق لے لی تھی۔ بندوق کا لائسنس والد صاحب کے نام تھا۔ والد صاحب بڑی مشکل سے بندوق دینے کیلئے راضی ہوئے تھے کیونکہ چیک ہونے کی صورت میں لائسنس منسوخ ہونے کا خطرہ تھا۔ میری اس یقین دہانی پر کہ میں بندوق صرف جنگل میں نکالوں گا اور اسے بہت احتیاط سے رکھوں گا۔ انہوں نے بندوق عنایت کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ ساتھ ہی ایس جی ایل جی اور چھروں والے کارتوس کے ڈبے بھی لا دیے۔ میں نے بندوق توڑ کر ڈبے میں بند کی۔ بندوق کا یہ ڈبہ بڑے بینجوں کے ڈبے کی طرح کا تھا۔ اب اس کے چیک ہونے کا بالکل خطرہ نہ تھا۔ ویسے بھی رات کو فرسٹ کلاس کے ڈبے میں ٹی ٹی وغیرہ مشکل ہی سے آتے تھے اور یہی سوچ کر میں نے رات کا سفر اختیار کیا تھا۔

گاڑی پانچ بجے شام پلیٹ فارم سے رینگتی ہوئی نکلی۔ میں دو برتھوں والے کوپے میں تھا۔ دوسری برتھ خالی پڑی تھی۔ گاڑی کیونکہ چل پڑی تھی اس لیے کسی بڑے سٹیشن کے آنے تک کوئی اور مسافر آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں نے

درواہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھالی اور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ کھلی کھڑکی سے مجھے بھاگتے ہوئے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ منظر کی یکسانیت سے تنگ آ کر میں نے سوٹ کیس سے رسالہ نکالا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

رسالہ پڑھتے پڑھتے ایسے ہی میری نظر سامنے والی برتھ کے نیچے پڑی۔ کسی چیز پر جم گئی۔ وہ ایک سرخ رنگ کی شال تھی جسے کوئی مسافر ڈبے میں بھول گیا تھا۔ بات اگر شال کی حد تک ہی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ میری تجسس کی ماری طبیعت نے برتھ کے نیچے ایک کونے میں پڑی شال کو پکڑ کر باہر کھینچا تو وہ وزنی سی معلوم ہوئی۔ اس شال کے اندر کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی "یا اللہ کیا چیز ہے اس میں ...!" میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی ... میں نے آہستہ آہستہ شال کو کھولا۔

اچانک ہی ایک انسانی ہاتھ پھسل کر برتھ پر گرا۔ یہ کسی عورت کا ہاتھ تھا جو کہنی سے کٹا ہوا تھا' اور تازہ تازہ خون اس میں سے بہہ رہا تھا۔ گورے رنگ کے اس بھرے بھرے ہاتھ سے عورت کی عمر پچیس تیس کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ ہاتھ کالے رنگ کی چوڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کلائی پر کہیں کہیں زخموں کے نشان تھے جو مزاحمت کے دوران چوڑیاں ٹوٹنے سے آئے ہوں گے۔ مخروطی انگلیوں میں ایک بھاری سی خوبصورت سونے کی انگوٹھی تھی۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے پٹریوں کے سینے پر دندناتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ دو منٹ کے بعد ایک ہالٹ آنے والا تھا اور ان دو منٹوں میں مجھے فیصلہ کر لینا تھا۔ ایک راہ تو یہ تھی کہ میں زنجیر کھینچ کر گاڑی رکواں اور گارڈ کو یہ ہاتھ پیش کر دوں۔

ایک فرض شناس شہری کی حیثیت سے مجھے کرنا بھی یہی چاہیے تھا لیکن یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کٹا ہوا ہاتھ پیش کرتے ہی میرا سالم ہاتھ پولیس کے ہاتھ میں آ جائے گا اور صدیوں تک مجھے عدالت اور تھانے کے چکر لگانے پڑیں گے۔ اس کے علاوہ بغیر لائسنس کی بندوق میرے پاس تھی۔ قسمت خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ممکن تھا یہ مصیبت میرے ہی گلے پڑ جاتی۔ تب میں نے فوری

فیصلہ کیا اور فرار میں ہی عافیت جانی۔ میں نے جلدی جلدی اس نازک ہاتھ کو شال میں لپیٹا' برتھ کے نیچے پھینکا اور اپنا سامان اٹھا کر کوپے سے باہر آ گیا۔

گیلری کے آخری سرے پر کھلے دروازے میں بھونچال کی طرح داخل ہو گیا۔ یہ ایک چار برتھوں کا کوپے تھا اور اس میں پہلے ہی سے دو مسافر موجود تھے۔ یہ ایک نوشادی شدہ جوڑا تھا اور انہوں نے نیچے والی دونوں برتھوں پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ ایک پر کچھ ملا جلا سامان تھا۔ جو پھیلا ہوا تھا اور دوسری برتھ پر بذات خود پھیلے بیٹھے تھے۔ میری آمد کو انہوں نے مداخلت بے جا تصور کیا۔ ان کی جگہ اگر میں ہوتا تو میں بھی یہی تصور کرتا لیکن میرے ساتھ مجبوری تھی۔ میں انہیں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا تھا۔ میں نے اوپر برتھ پر قبضہ جما لیا۔ ان کی پیشانی کی شکنوں کو ایک بھرپور مسکراہٹ سے برابر کرنا چاہا لیکن اس کا ان پر اثر نہ ہوتے دیکھ کر فوراً اپنی قیمتی مسکراہٹ پر اسٹاپ مارا اور برتھ کو اپنی جاگیر سمجھ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ اتنے میں ہالٹ آ گیا۔ منظور گڑھی پر گاڑی ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں رکتی تھی۔

وہ صاحب جن کے دونوں ہاتھوں پر گہری مہندی لگی تھی' اپنی برتھ سے اٹھے اور "ابھی آیا" کہہ کر باہر نکل گئے۔ مجھے یہ بات سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ وہ صاحب جن کے ہاتھ کی مہندی ابھی میلی نہ ہوئی تھی۔ "ابھی آیا" کہہ کر کہاں گئے ہیں۔

ان کے واپس آنے تک گاڑی میں حرکت آ چکی تھی۔ وہ صاحب خوش خوش اندر آئے۔ اپنی بیوی سے آہستہ سے کچھ کہا اور وہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ اچھے قد اور اچھے جسم کی لڑکی تھی۔ جب کہ مہندی لگے ہاتھ کا قد پستہ اور صورت "چشم بددور" تھی۔ اس لنگور نے جلدی جلدی اپنا سامان اٹھایا اور اپنی حور کے ساتھ ڈبے سے نکل گیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے اس کیبن سے نکل کر کس مصیبت کو دعوت دی ہے۔ میں جانتے ہوئے بھی ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دو برتھوں والے کوپے میں بدقسمتی سوئی ہوئی ہے۔ ان دونوں کے باہر نکلتے ہی میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دونوں برتھوں کے نیچے اچھی طرح جھانک کر دیکھا کہ

یہاں تو کوئی مصیبت نہیں لینی۔

خدا کا شکر تھا کہ اس کیبن میں لاش کا کوئی حصہ موجود نہ تھا۔ میں نے عادت کے مطابق پھر پاؤں پھیلا لیے۔

معاً ایک خیال ذہن میں کوندا اور میں بڑی پھرتی سے تڑپ کر اٹھا اور ڈرتے ڈرتے باتھ روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ محترمہ باتھ روم میں براجمان ہوں۔ میرے خیال کے مطابق لاش کے تمام حصے اسی گاڑی میں ہونے چاہیے تھے۔ قتل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ہاتھ کی تازگی بتاتی تھی کہ دو اڑھائی گھنٹے پہلے کا حادثہ ہے یہ۔ لیکن دن دہاڑے یہ قتل ہوا کس طرح؟ جو گاڑی بریلی سے دن کے ڈیڑھ بجے علی گڑھ آتی تھی وہی گاڑی شام کو پانچ بجے واپس ہو جاتی تھی۔ اس عرصہ میں یہ ڈبے شیڈ میں کھڑے رہتے تھے۔ اسی عرصہ میں لاش کو اس ڈبے میں ڈال دیا گیا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ باتھ روم میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے دیکھ کر دل کی دھڑکن تیز ہوتی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی برتھ پر نیم دراز ہو گیا۔ رسالہ کھول کر ابھی ورق گردانی شروع کی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

کون آ گیا؟ کوئی مسافر... لیکن گاڑی تو ابھی چل رہی تھی۔ مسافر درمیان میں کہاں سے آ گیا؟ ارے! کہیں وہ جوڑا تو نہیں؟ ممکن ہے انہوں نے شال کھول کر دیکھ لی ہو۔ میں تیزی سے اٹھا' دروازہ کھولا۔ دروازے پر نہ کوئی مسافر تھا نہ وہ نو بیاہتا جوڑا۔ ٹکٹ چیکر صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں نے ٹکٹ دکھا کر دروازہ بند کر لیا۔

رسالہ پڑھتے پڑھتے شام گہری ہو گئی۔ میں رسالہ چھوڑ کر ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنے لگا۔ مغرب میں سرخی پھیلی ہوئی تھی جبکہ سبز درختوں پر سیاہی بڑھتی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کے علم بردار کو آسمان نے نگل لیا۔ سرخی سیاہی

مائل ہو گئی۔ یہاں تک کہ ہر سو اندھیرا چھا گیا۔

سورج غروب ہونے کے ساتھ میرا دل ہمیشہ اداسی میں ڈوب جاتا ہے لیکن یہ کیفیت دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں رہتی۔ اس وقت بھی مجھ پر بے کیفی سی چھا گئی تھی۔ اچانک ہی ڈبہ روشن ہو گیا۔ بجلی جلی تو دل میں پھر سے کرن سی پھوٹی۔

سفر کی وہ رات اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے آج بھی یاد ہے۔ رات کا سفر میں نے صرف اس لیے اختیار کیا تھا کہ آرام سے سوتا ہوا جاؤں گا لیکن اس زنانے ہاتھ نے وہ ہاتھ دکھایا تھا کہ نیند کو کسی کروٹ قرار نہیں آ رہا تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہا کہ اب شال سے ہاتھ برآمد ہوا' زنجیر کھینچی' ڈبے میں کھلبلی مچی اور پھر وہی پولیس کا چکر! صبح کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

گہری نیند میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہے۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ نیند ٹوٹی تو میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہاتھ ہلانے والے کو دیکھا ارے! میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی پر نظر کی تو سات بج رہے تھے۔ گاڑی کب کی بریلی پہنچ چکی تھی۔

میرے سامنے میرے چچا زاد بھائی رئیس خان کھڑے تھے اور میری حیرانی اور پریشانی سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ گاڑی صرف بریلی تک ہی آتی ہے اگر آگے جاتی تو تم کہاں پہنچے ہوتے؟ معلوم ہے۔'' رئیس خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یار یہ گاڑی میں تم کس طرح سو جاتے ہو۔ اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں پورے ایک گھنٹہ سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔''

''لیکن آپ ڈبے کے اندر کس طرح آ گئے۔ دروازہ تو ابھی تک اندر سے بند ہے۔'' میں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ادھر سے۔'' رئیس خان نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایک تو آج گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ پہنچی تو حضرت جی غائب۔ پوری گاڑی چھان ماری ایک

ایک مسافر دیکھ لیا۔ یا اللہ یہ ہمارا شیر کہاں غائب ہو گیا؟ کیا معلوم تھا کہ شیر کمپارٹمنٹ کا اندر سے دروازہ بند کیے اپنا سب کچھ بیچ کر سویا ہوا ہے۔ اب جلدی اٹھو یار۔ گھر پر سب منتظر ہوں گے۔''

میں نے فوراً ہی برتھ سے چھلانگ لگائی۔ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

معاً میرے ذہن میں وہ زنانہ ہاتھ گھوم گیا۔ اس ہاتھ کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ اب تک برآمد کیوں نہیں ہوا؟ ہوسکتا ہے میرے بعد اس کیبن میں کوئی گیا ہی نہ ہو۔ اس نو بیاہتا جوڑے کے بارے میں محض میرا خیال ہی ہو کہ وہ یہاں سے میرے کیبن میں گیا ہے۔ اگر گئے بھی ہوں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری طرح چپکے سے کھسک لیے ہوں۔ پھر تو وہ ہاتھ اسی کیبن میں پڑا ہوگا۔

''ارے یار! ابھی تک نیند میں ہو۔ باہر نکلنے کا دروازہ ادھر ہے اور تم ادھر چلے جا رہے ہو۔''

''رئیس بھائی ایک منٹ۔'' میں نے ہاتھ والے کیبن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر برتھ کے نیچے جھانکا۔ اب وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ شال نہ ہاتھ۔

''یہاں کیا تلاش کر رہے ہو؟'' رئیس خان اندر آتے ہوئے بولے۔

''یہاں میں جو چیز تلاش کر رہا ہوں اسی نے تو مجھے اتنی گہری نیند سلایا۔'' میں نے کیبن سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''کیا چیز تھی؟ کیا نیند کی گولیاں تھیں؟'' رئیس بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا

''آیئے باہر نکل آیئے پھر بتاتا ہوں کیا تھا یہاں۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ہاتھ کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ کہاں غائب ہو گیا؟ پھر اس ہاتھ میں مجھے بھاری سی سونے کی انگوٹھی کا خیال آیا۔ کہیں

ایسا تو نہیں کہ کوئی مسافر انگوٹھی کے لالچ میں ہاتھ اپنے سوٹ کیس میں ڈال کر لے گیا ہو۔ پھر خیال آیا کہ انگوٹھی کی وجہ سے ہاتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ انگوٹھی تو ہاتھ سے اتاری بھی جا سکتی تھی۔

پھر وہ پراسرار ہاتھ کہاں غائب ہو گیا؟''

اسٹیشن سے باہر نکل کر جب میں نے رئیس بھائی کو پورا واقعہ سنایا تو انہوں نے میری طرف بڑے عجیب انداز سے دیکھا اور بولے: ''یار تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھ لیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب حقیقت معلوم ہونے لگتے ہیں۔''

رئیس بھائی کو اس سلسلے میں کچھ سمجھانا بیکار تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے؟ وہ ہاتھ آخر گیا کہاں؟

آج بھی جب یہ واقعہ یاد آ گیا ہے اور اس سے پہلے بھی جب کبھی یاد آیا تو جسم میں سنسنی پھیل گئی، جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ہاتھ کس کا تھا؟ کہاں سے آیا اور کہاں غائب ہو گیا؟ میں آج تک نہ جان سکا۔ اس واقعہ کو سننے والے سب یہی کہتے ہیں یار تم نے خواب دیکھا ہو گا اب تو کبھی کبھی مجھے بھی خواب کا گمان گزرنے لگتا ہے۔

گھر پہنچ کر میں پہلے خوب مزے سے نہایا، ناشتہ تیار تھا خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد گھر والوں سے گپ شپ شروع ہو گئی۔

چچا گھر پر موجود نہ تھے۔ وہ ٹنک پور میں کٹائی کی نگرانی کر رہے تھے۔ رئیس خان بھی کل ہی میری وجہ سے بریلی پہنچے تھے تاکہ مجھے اپنے ساتھ ٹنک پور لے جائیں۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ جیپ سے چلیں گے اور فجر کے وقت بریلی سے نکل کھڑے ہوں گے۔

صبح ہم لوگ نماز پڑھتے ہی جنگل کی جانب چل پڑے۔ رئیس بھائی اور میرے علاوہ دو ملازمین بھی تھے جنہیں راستے کی حفاظت اور ضرورت کے تحت

ساتھ لے لیا گیا تھا۔

شہر سے نکلتے ہی رئیس بھائی نے گاڑی کی رفتار بڑھانی شروع کی۔ رفتار بڑھانے سے پہلے مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''تیز رفتاری سے گھبراتے تو نہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے بڑی لاپروائی سے کہا۔ ''اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے موت سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ ہاں لولے لنگڑے ہونے سے ضرور ڈر لگتا ہے۔ اس لیے آپ گاڑی کہیں ماریں تو اچھی طرح ماریں۔''

''خدا نہ کرے۔'' رئیس بھائی ایکدم سنجیدہ ہو گئے۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم سپیڈ سے نہ چلے تو ٹنک پور پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی اور رات کا سفر درندوں سے بھرے جنگل میں کچھ زیادہ خوشگوار نہ ہو گا۔''

''ٹھیک ہے آپ گاڑی دوڑائیے بلکہ اڑائیے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

میری طرف سے مطمئن ہو کر رئیس بھائی نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور یوں گاڑی ساٹھ ستر کے درمیان چلنے لگی۔ رئیس بھائی نے جنگل کی باتیں چھیڑ دیں۔ رئیس بھائی اگرچہ عمر میں مجھ سے چار پانچ سال بڑے تھے لیکن ان کے رکھ رکھاؤ میں بزرگی نہ تھی۔ وہ بے تکلفی سے گفتگو کرنے کے عادی تھے۔

وہ بڑے دلچسپ انداز میں مجھے جنگلات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ذکر باغوں کی کٹائی سے ہوتا ہوا شکاریات اور شکاریات سے درندوں کی عادتوں تک جا پہنچا۔

رئیس بھائی! ''کچھ ریچھ کے بارے میں بتائیں۔''

''ریچھ!'' رئیس بھائی نے ایک لمحہ مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ ''بھئی ریچھ بڑا عجیب جانور ہے میرا تو اس سے براہ راست کبھی واسطہ نہیں پڑا لیکن شکاریوں سے اس کے بارے میں سن بہت رکھا ہے۔ یہ بڑا پراسرار جانور ہے۔ اب تم شیر کو دیکھو تو اس کی شخصیت سیدھی صاف معلوم ہوتی ہے۔ اس کا رعب داب' گھن گرج' غصہ' جسم کی کشش سب کچھ ایک نظر میں سامنے آ جاتا ہے لیکن ریچھ کی شخصیت بڑی

ڈھکی چھپی' تہہ در تہہ دبی محسوس ہوتی ہے۔ ریچھ کا پورا جسم بڑے بڑے بالوں میں چھپا ہوتا ہے۔ ہمیں اس کی تھوتھنی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ بڑی پر پیچ شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے جسم کے روئیں روئیں میں اسرار چھپے ہوتے ہیں۔

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ مثلاً کسی ایک جانور کو لو' چلو شیر ہی کو لے لو' کیا کھاتا ہے وہ؟'' رئیس بھائی نے سوال کیا۔

''گوشت۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے گوشت کھاتا ہے۔'' مان لیتا ہوں اب یہ بتاؤ گھاس تو نہیں کھاتا' پھل تو نہیں کھاتا؟''

''میں نے تو نہیں سنا۔''

''یہ جو ریچھ صاحب ہیں' یہ مختلف نوعیت کی چیزیں کھاتے ہیں۔ کسی ایک چیز پر تکیہ نہیں۔ مثلاً سبزی سے شوق فرماتے ہیں' مچھلیاں کھاتے ہیں' شہد کے عاشق ہیں اور کبھی موڈ ہو تو گوشت پر بھی ہاتھ صاف کر جاتے ہیں۔''

''حیرت ہے۔''

''ابھی کہاں حیرت' حیرت تو آگے آئے گی۔ جب تمہیں معلوم ہو گا کہ ایک نو فٹ لمبا ریچھ ایک گائے کو منہ میں دبا کر بڑی آسانی سے پہاڑ پر چڑھ سکتا ہے اور حیرت اس وقت ہو گی جب تمہیں معلوم ہو گا کہ اس کی نظر بے حد کمزور ہوتی ہے لیکن سونگھنے کی قوت بے پناہ ہوتی ہے۔ یہ خوراک خصوصاً شہد کی تلاش میں میلوں پیدل نکل جاتا ہے۔ اگرچہ شیر چیتے کی طرح جست نہیں لگا سکتا ان کی طرح تیز بھی نہیں دوڑ سکتا اس کے باوجود چھوٹی چھوٹی جستوں پر مشتمل اس کی رفتار کم نہیں ہوتی۔ درختوں پر آسانی سے چڑھ سکتا ہے۔ متوازی تنوں پر کھڑے ہو کر چل سکتا ہے۔ اپنی مادہ سے بہار کے موسم میں صرف ایک دو مرتبہ ملتا ہے اور ظالم اتنا ہے کہ ریچھنی کو مصیبت میں مبتلا کر کے بالکل الگ ہو جاتا ہے۔ پلٹ کر

بھی نہیں دیکھتا کہ اس کی مادہ کس حال میں ہے۔ حتیٰ کہ اپنے بچوں کو بھی دیکھنے نہیں آتا۔ ریچھنی سال میں ایک یا دو بچوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ بچے خرگوش کے برابر ہوتے ہیں۔ ریچھنی ایک طویل عرصے تک بغیر کچھ کھائے پیئے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے۔''

''رئیس بھائی آپ تو خاصی معلومات رکھتے ہیں' ریچھ کے بارے میں۔''

''ہاں اور سنو برائے نام دم والے اس جانور کی زبان خاصی لمبی ہوتی ہے۔ اس کو چیزوں کو چاٹنے کا شوق ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے بالوں اور ناخنوں سے جادو ہوسکتا ہے۔ یہ سو بلاؤں کی ایک بلا ہوتا ہے' پہاڑی مزدور اپنے بچوں کو اس کی پیٹھ پر بٹھا کر انہیں بلاؤں سے محفوظ کرتے ہیں۔''

''میں نے سنا ہے کہ ریچھ کو عورتوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ انہیں اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے؟ میں نے جھجکتے جھجکتے سوال کیا۔

''ہاں اس معاملے میں ریچھ خاصا بدنام ہے اور بدنام ہے تو اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ افسانے یوں ہی تو نہیں بن جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر عورت اس کی گرفت میں آ جائے تو پھر وہ اسے نہیں چھوڑتا۔ اٹھا کر لے جاتا ہے اور اس کے پاؤں چاٹ چاٹ کر اسے چلنے پھرنے سے معذور کر دیتا ہے اور پھر وہ خباثت پر اتر آتا ہے۔''

☆......☆......☆

دوپہر کو کھانے کیلئے ہم لوگ راستے میں ایک ہوٹل پر رک گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر پھر سفر کا آغاز ہوا۔ ''ٹنک پور ہم شام گہری ہوتے ہی پہنچ گئے اور یہ کرشمہ رئیس بھائی کی تیز رفتاری کا تھا۔''

پڑاؤ پر پہنچتے پہنچتے مزید ایک گھنٹہ لگا اور یہ سفر ہم نے پہاڑی راستوں پر پیدل چل کر کیا۔ جنگل کی سائیں سائیں' تاریکی' ٹارچوں کی دھیمی روشنی' چار پانچ

آدمی' ایک رائفل' ایک بندوق اگرچہ اس علاقے میں درندوں کا گزر نہ تھا پھر بھی خوف محسوس ہوتا رہا۔

چچا جان مجھے دیکھ کر خاصے خوش ہوئے۔ کھانے کا انتظام انہوں نے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ ہم نے پہنچتے ہی ہاتھ منہ دھویا اور دسترخوان پر آسن جما کر بیٹھ گئے۔ لالٹین کی روشنی میں کیا کھایا یہ تو معلوم نہیں۔ بہرحال جو کچھ کھایا خاصا مزے دار تھا۔ کھانے کے بعد سفر کی تھکن نے آنکھوں میں نیند بن کر اترنا شروع کیا اور میں گھاس کے بے حد نرم بستر پر پڑ کر سو گیا۔

ہم دونوں خاصی دیر سے اٹھے۔ دن چڑھ چکا تھا۔ ہم دونوں نے ضروریات سے فارغ ہونے کیلئے چشمے کی طرف رخ کیا۔ جب ہم آدھا میل کا دشوار گزار راستہ طے کر کے چشمے پر پہنچے تو وہاں پہنچ کر جی خوش ہو گیا۔

پہاڑیوں کے درمیان بہتا ہوا یہ چشمہ حسن فطرت کا حسین نمونہ تھا۔ چشمے کا صاف شفاف پانی' اس میں پڑے ہوئے پتھر دیکھنے کی چیز تھے۔ ہم لوگ نہا دھو کر وہاں سے پڑاؤ میں واپس آ گئے۔

دوپہر کو رئیس بھائی اور چچا جان کسی ضروری کام سے فارسٹ آفیسر سے ملنے گئے۔ میں نے تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر کندھے پر' بندوق رکھ کر چشمے کی طرف چل دیا۔

راستے میں مجھے کئی پہاڑی مرد اور عورتیں ملیں۔ وہ مجھے آتا دیکھ کر سلام کرتے اور پھر ادب سے ایک طرف ہو جاتے۔ میرے گزرنے کے بعد وہ پھر اپنی راہ پر ہو لیتے۔ شاید انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں ٹھیکیدار کا بھتیجا ہوں۔

ابھی میں چشمے پر پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ کسی نے چلتے چلتے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں سمجھا شاید رئیس بھائی آ گئے۔ جب میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو میری روح کانپ اٹھی۔

☆......☆......☆

میں اچانک جس سنگین صورتحال سے دوچار ہو گیا تھا اس کا تصور میں خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں وہ ناقابل یقین تھا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روکنے والا ایک بھیانک خواب کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔

''وہ کون تھا؟''

وہ ایک دیو قامت ریچھ تھا۔ نہیں ... وہ ریچھ نہیں تھا۔ اس کے بال ضرور ریچھ جیسے تھے بڑے بڑے ایک دم کالے کیا وہ انسان تھا؟ نہیں وہ انسان بھی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ ضرور انسانوں سے ملتا جلتا تھا۔ پھر وہ کیا تھا؟ ریچھ نما انسان یا انسان نما ریچھ؟ وہ جو کچھ بھی تھا تھا بڑا ہیبت ناک اور میں اس کی مکمل گرفت میں تھا۔

اس وقت میں جہاں کھڑا تھا وہ مشکل سے دو فٹ چوڑی پگڈنڈی ہو گی۔ اس پگڈنڈی کے ایک طرف کئی سو فٹ گہری کھائی تھی اور دوسری طرف کئی سو فٹ اونچی پہاڑی ۔ اگر یہ ریچھ نما انسان میرے ساتھ انتہائی شرافت سے پیش آتا مجھے کچھ نہ کہتا صرف اتنا کرتا کہ مجھے پگڈنڈی سے ہٹا کر آگے بڑھ جاتو تو میرا کھائی میں گر کر اللہ کو پیارا ہو جانا یقینی تھا۔ میرے کندھے پر اگرچہ بندوق رکھی تھی اور اس میں دو طاقتور کارتوس بھی پڑے ہوئے تھے لیکن بندوق کو کندھے سے اتارنے کی اجازت نہ تھی۔ اس عجیب الخلقت مخلوق نے مجھے اچانک ایسا

گرفت میں لیا تھا کہ میں کلمہ پڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔

سو میں نے ایسا ہی کیا۔ آنکھیں بند کر کے اللہ کو یاد کیا۔ اپنے اگلے پچھلے گناہوں کی معافی مانگی۔ ابھی یہ معافی تلافی کا دور چل ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے کندھے کو ہلکا محسوس کیا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ستمگر پہاڑی پر درختوں کے تنوں میں جھولتا اوپر چڑھا چلا جا رہا ہے۔ بندوق کو کندھے سے اتار کر خدا کا شکر ادا کیا اور چشمے کی طرف جانے کی بجائے پڑاؤ کی طرف رخ کیا۔ اس اچانک ملاقات نے میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔

میرے حواس ابھی تک بحال نہ ہوئے تھے۔ میں تیزی سے پڑاؤ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ایک مشکل یہ تھی کہ ان دشوار گزار راستوں پر تیزی سے چلنا بھی آسان نہ تھا۔ جب کوئی پگڈنڈی آ جاتی جس کے ایک طرف کھائی اور دوسری طرف اونچی پہاڑیاں ہوتیں تو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ جنگل کی زندگی دیکھنے کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے تھے۔ رئیس بھائی نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ جنگل کی کٹائی شروع ہوتے ہی جنگلی جانور اس علاقے کو خالی کر جاتے ہیں۔ انسانوں کی آمد ان کیلئے موت کا پیغام ہوتی ہے لیکن میری ملاقات پہلے ہی دن ایک ایسے عفریت سے ہو گئی تھی جو سو درندوں کا ایک درندہ تھا اور انسانوں سے بھرے اس جنگل میں دندناتا پھر رہا تھا۔

تھوڑا آگے چلا ہوں گا تو مجھے منشی نظر آیا۔ وہ میرے دائیں جانب والے راستے سے کہیں اوپر سے آ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا میری طرف آیا۔

''سلام صاحب.....!'' مجھے سلام کر کے اس نے بڑے مودبانہ انداز میں بندوق میرے ہاتھ سے لینی چاہی۔

''ارے نہیں منشی۔ ٹھیک ہے اسے رہنے دو میرے پاس۔'' میں نے بندوق کو کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں صاحب! یہ نہیں ہو سکتا۔ ملازموں کے ہوتے ہوئے آپ بوجھ اٹھائیں۔ لائیے دیجئے بندوق۔'' اس نے بڑے خلوص سے کہا اور میرا جواب سنے بغیر ہی اس نے بندوق اپنی گرفت میں لے لی۔

''منشی! بندوق لوڈ ہے۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔

''فکر نہ کریں صاحب۔ میں کارتوس نکالے لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کارتوس نکالنے کیلئے بندوق اوپر اٹھائی۔ ''یہاں آس پاس تو آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ آپ کیا چشمے کی طرف گئے تھے؟''

''منشی! بندوق لوڈ رہنے دو۔'' میں نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''کیوں صاحب؟ خیر تو ہے۔ اس علاقے میں تو آپ کو کوئی چیز شکار کرنے کو نہ ملے گی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''لیکن شکار ہونے سے تو بچائے گی۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب صاحب؟ میں سمجھا نہیں۔'' اس نے بندوق خالی کیے بنا ہی اپنے کندھے پر رکھ لی۔ ''آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟''

''منشی چچا جان کا سب سے پرانا ملازم تھا بلکہ ایک طرح سے چچا ہی نے اسے پالا تھا۔ جنگلات کا تمام حساب کتاب اس کے پاس تھا۔ شاید اسی لیے اس کا نام منشی پڑ گیا تھا۔ حساب کتاب کے علاوہ وہ مزدوروں کی زبان با آسانی بول سکتا تھا۔ وہ انہی میں گھلا ملا رہتا تھا۔ پہاڑی مزدور اس سے بہت خوش تھے۔ اس طرح سے وہ کم داموں میں زیادہ سے زیادہ کام ان سے لیا کرتا تھا۔

''منشی! کیا تم یہاں کے تمام علاقوں سے واقف ہو......؟''

''ہاں جی! اس جنگل میں ہم کئی سالوں سے ٹھیکے لے رہے ہیں۔ پہلے

سال تو ذرا کچھ دقت ہوئی تھی۔ ناواقفیت کی بنا پر ہمارے دو تین مزدوروں کو جنگلی جانوروں نے کھا لیا تھا لیکن اب تو اللہ کا فضل ہے۔ جنگلی جانوروں کا دور دور تک پتہ نہیں اور میں کٹائی کے تمام علاقوں سے واقف ہوں۔'' منشی نے بڑے اعتماد سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''منشی! میں ابھی چشمے کی طرف گیا تھا لیکن راستے میں ہی سے واپس آ گیا۔''

''کیوں صاحب واپس کیوں آ گئے؟''

''واپس اس لیے آ گیا منشی کہ اکیلا آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔''

''کیا وجہ ہوئی صاحب؟'' منشی کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں؟''
ناہموار اور تنگ راستوں پر آپ کیلئے چلنا دشوار ہوگا۔ کوئی بات نہیں صاحب شروع شروع میں میدانی لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ دو تین دن میں آپ رواں ہو جائیں گے۔''

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اگر یہی صورتحال رہی تو میں کہیں یہاں سے روانہ نہ ہو جاؤں۔''

''ایسا کیا ہوا صاحب؟ کچھ تو بتائیں۔''

''پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ اس علاقے میں تم نے کوئی غیر معمولی چیز دیکھی.. یا کسی مزدور سے کچھ سنا۔'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''نہیں ابھی تک تو کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی۔''

''لیکن میرے سامنے آ گئی ہے۔ ایک دم انوکھی ناقابل یقین بات۔''

اس مرتبہ منشی نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا صرف میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نے ایک ایسا آدمی دیکھا ہے جو ریچھ تھا یا یوں کہو کہ میں نے

ایک ایسا ریچھ دیکھا جو آدمی تھا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں، صاحب؟'' منشی میری بات سن کر پریشان ہو گیا۔

جب میں نے منشی کو پوری تفصیل سے بتایا تو وہ مزید پریشان ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے جائے واردات پر چلنے کی فرمائش کرے گا۔ شاید اسی لیے اس نے سامنے سے گزرتے ہوئے دو مزدوروں کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا تھا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اس نے مزدوروں سے پہاڑی زبان میں کچھ بات کی اور بندوق میرے ہاتھ میں تھما کر وہ ان مزدوروں کے ساتھ رفو چکر ہو گیا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے لیکن اتنی پیاری ہوتی ہے یہ آج ہی معلوم ہوا۔ خیر میں بندوق مضبوطی سے پکڑے چاروں طرف چوکنا انداز میں دیکھتا ہوا پڑاؤ میں آ گیا۔

پڑاؤ اس جھونپڑی کا نام تھا جس میں دو لکڑی کے بے حد مضبوط صندوق، ایک لالٹین اور اسی طرح کی چند ضروری اشیاء موجود تھیں۔ اس جھونپڑی میں چچا جان، رئیس بھائی اور میں رہائش پذیر تھے اور اس گنجان جنگل میں رہائش کی یہ آسائش کسی عیش سے کم نہ تھی۔ ہماری جھونپڑی سے سو گز کے فاصلے پر پہاڑی مرد اور عورتوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ شام ہوتے ہی ان جھونپڑیوں میں رونق لوٹ آتی تھی۔ ایک ہنگامہ سا مچ جاتا۔ کنائی کا کام ایسے وقت بند کر دیا جاتا تھا کہ تمام مزدور اندھیرا پھیلنے سے پہلے اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ آئیں۔ مزدور مرد، عورت اپنے ٹھکانوں پر لوٹتے تو خوب شور مچاتے۔ ہماری جھونپڑی تک ان کے زور زور سے باتیں کرنے اور ہنسی ٹھٹھے کی آوازیں صاف سنائی دیتیں۔ کبھی ڈھول پیٹنے کی آواز آتی اور ساتھ ہی عورتوں اور مردوں کے گانے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ یہ لوگ اپنی جھونپڑیوں کے آگے آگ جلا کر اس کے گرد بیٹھ جاتے اور دیر تک گانے بجانے میں مصروف رہتے۔ دن بھر کی تھکن اتارنے کا ان غریبوں کے

پاس یہی ایک ذریعہ تھا۔ کبھی زیادہ موڈ میں ہوتے تو اٹھ کر رقص کرنے لگتے۔

جھونپڑی خالی تھی۔ میں بندوق ایک کونے میں کھڑی کر کے نرم دبیز بستر پر لیٹ گیا اور رسالہ پڑھنے لگا۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے جانے کب نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو چچا جان اور رئیس بھائی آ چکے تھے۔

''کہو بھئی، کہیں باہر گھومنے نہیں نکلے؟'' چچا جان نے مجھے جاگتا دیکھ کر پوچھا۔

''آپ لوگوں کے جانے کے بعد میں چشمے کی طرف گیا تھا۔'' میں اٹھتا ہوا بولا۔

''بہت خوبصورت جگہ ہے بھئی وہ۔''

''ہاں جگہ تو بہت اچھی ہے، اتنی اچھی کہ وہاں سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا لیکن راستہ بہت دشوار گزار ہے۔ وہاں پہنچنے کیلئے کئی پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے اور آج تو میں مرتے مرتے بچا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کہیں پھسل گئے تھے کیا؟'' رئیس بھائی نے پوچھا۔

''نہیں پھسلا نہیں۔ میں چشمے کی طرف بڑے اطمینان سے چلا جا رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔''

''کون تھا وہ؟''

پھر مجھ پر جو بیتی تھی وہ تمام تر جزئیات کے ساتھ کہہ سنائی۔ اس ریچھ انسان کا ذکر سن کر دونوں سنانے میں آ گئے اور کیوں نہ آتے بات ہی ایسی تھی۔

''بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' چچا جان کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد رئیس بھائی سے مخاطب ہو کر بولے۔

''سمجھ میں تو خود میری بھی نہیں آیا۔'' رئیس بھائی نے اپنی کیفیت بیان کی۔

''یہ ٹھیک ہے کہ اس جنگل میں ہر طرح کے جنگلی جانور موجود ہیں لیکن وہ جنگل میں انسانوں کی آمد کے بعد کہیں اندر چلے جاتے ہیں۔ تین سال سے تو میں اس علاقے کا ٹھیکہ لے رہا ہوں۔ کبھی کوئی ایسی بات سننے میں نہیں آئی۔ کوئی کہے میں نے ریچھ دیکھا ہے تو اس کے بارے میں یقین کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی ریچھ شہد کی تلاش میں اس طرف نکل آیا ہو لیکن تم نے جس طرح کی مخلوق دیکھی ہے اس کا تو سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ پتہ نہیں تم نے کیا دیکھ لیا؟'' چچا جان نے آخر اپنے دل کی بات کہہ دی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

اگر میں اس عفریت کو بچشم خود نہ دیکھتا تو شاید میری بھی یہی کیفیت ہوتی۔ پتہ نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ ایسے ناقابل یقین واقعات میرے ساتھ کیوں پیش آ رہے تھے۔ ابھی وہ ٹرین والا معمہ ہی حل نہ ہو سکا تھا کہ اس عفریت نے مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ میں بے یقینی کے حصار میں مقید ہو گیا تھا۔

''آخر کیا چیز تھی وہ؟'' چچا جان جیسے خود سے ہم کلام تھے۔ اس مسئلے پر منشی سے بات کرنی چاہیے۔''

منشی کا نام سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے جب چچا جان کو منشی کے بندوق لینے اور پھر خاموشی سے دے کر بھاگنے کا منظر بتایا تو وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

''یہ لوگ بڑے توہم پرست ہوتے ہیں' اس نے کوئی جن بھوت سمجھ لیا ہوگا۔''

رئیس بھائی نے رائے دی۔

''کیا پتہ ایسا ہی ہو؟'' چچا جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے کیا' بات کرتے ہیں' ابا جان آپ۔ کیا آپ بھی توہم پرستوں میں سے ہو گئے۔'' رئیس بھائی نے سنجیدگی اختیار کی۔

''یہ صرف ایک خیال تھا جس کی صداقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''آؤ ذرا باہر چل کر دیکھتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں منشی نے مزدوروں سے اس واقعہ کا ذکر نہ کر دیا ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو مزدوروں میں دہشت پھیل جائے گی۔ وہ لوگ کام چھوڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ پہلے منشی سے بات کر لیں' اسے سمجھا کے پھر چشمے کی طرف چلیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ بلا کہیں آس پاس ہی ہو۔'' رئیس بھائی نے رائفل اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں نے رئیس بھائی کو رائفل اٹھاتا دیکھ کر کارتوسوں کی پیٹی گلے میں لٹکائی اور بندوق کندھے پر رکھ کر ان کے ساتھ چلنے کیلئے راضی ہو گیا۔

''بیٹے اکیلے مت جانا' اپنے ساتھ دو چار مزدور لے لینا۔ چچا جان نے ہمیں کمر کستا دیکھ کر ہدایت فرمائی۔

ہم دونوں ''جی بہتر'' کہتے ہوئے باہر نکلے آئے۔

پہلے ہم نے منشی کو اس کی جھونپڑی میں دیکھا۔ وہ وہاں موجود نہ تھا۔ رئیس بھائی کو اس کا دوسرا ٹھکانہ معلوم تھا ہم دونوں اس طرف چل دیئے۔

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے سامنے سے ایک پہاڑن آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے سر پر بانسوں کا گٹھڑ تھا اور وہ بڑی بے تکلفی سے اونچے نیچے پتھریلے راستے پر چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کی چال میں ہرنیوں جیسی تیزی تھی۔

''اس مزدور عورت کو دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔''

''اس کے سر پر کتنا وزن ہے' کچھ اندازہ کر سکتے ہو۔''

''دس بیس سیر تو ہوگا ہی۔'' میں نے کہا۔

وہ عورت اب ہمارے نزدیک آ چکی تھی۔ اس نے ٹھیکیدار کے بیٹے اور

بھتیجے کو دیکھا تو احتراماً کھڑی ہوگئی تاکہ ہم لوگ آسانی سے گزر جائیں۔

رئیس بھائی نے اشارے سے اس سے کچھ کہا۔

اس نے اشارہ سمجھتے ہی گٹھڑ زمین پر پھینک دیا۔

''ذرا اٹھا کر دیکھو۔'' رئیس بھائی تماشے پر اتر آئے۔

زیادہ وزنی تو نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کہہ کر جب میں نے گٹھڑ اٹھانے کیلئے زور لگایا تو وہیں کا وہیں رہ گیا۔ وہ گٹھڑ اتنا وزنی ہوگا' اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ میں اسے زمین سے بالشت بھر اونچا بھی نہ اٹھا پایا۔ وہ ایک ڈیڑھ من سے کیا کم ہوگا۔

تب مجھے اس پہاڑی مزدور عورتوں کی جفاکشی اور مہارت کا علم ہوا۔ ہمارے لیے تو ان اونچے نیچے خطرناک راستوں پر خالی ہاتھ چلنا ہی مشکل تھا کہ یہ عورتیں نہ صرف اتنا وزن سر پر لادتیں بلکہ چلتیں بھی اس روانی سے کہ دوڑنے کا گمان ہوتا۔

پھر رئیس بھائی نے یہ بتا کر مزید پریشان کر دیا کہ یہ عورتیں اپنے مردوں سے کہیں زیادہ بوجھ اٹھا لیتی ہیں۔ تب مجھے اپنے شہر کی عورتیں یاد آئیں اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھر گئی اگر ہماری عورتوں کو چند دن ایسا کام کرنا پڑے تو شاید ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے۔

بانسوں کے اس گٹھڑ کو میں نے اور رئیس بھائی نے سہارا دے کر اس عورت کے سر پر رکھا۔ گٹھڑ سر پر آتے ہی اس عورت کے جسم میں بجلی سی بھر گئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی راہ چلی گئی۔ میں آنکھوں سے اوجھل ہونے تک اس عورت کو دیکھتا رہا۔ اس کی جفاکش کو سلام کرتا رہا۔

''اس جنگل میں سانپ بہت ہیں۔'' رئیس بھائی نے چلتے چلتے انکشاف کیا۔

''پھر تو آئے دن مزدور موت کا شکار ہوتے ہوں گے۔''

''نہیں۔ بہت کم۔''

''کیوں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے رئیس بھائی کو دیکھا۔

''کیا اس جنگل کے سانپ زہریلے نہیں ہوتے؟''

''بے حد زہر بھرا ہوتا ہے ان سانپوں میں لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسانوں پر حملہ نہیں کرتے اگر انہیں چھیڑا جائے تو پھر بخشتے نہیں۔''

''ابھی یہ ذکر چل ہی رہا تھا کہ اوپر سے منشی آتا ہوا دکھائی دیا۔ حالت یہ تھی کہ چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ دو مزدور آگے' دو مزدور پیچھے اور درمیان میں خود سہمے سہمے چلے آتے تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی ذرا سنبھلنے کی کوشش کی۔ گردن اکڑائی سینہ پھلایا اور اگلے دو مزدوروں کو ہٹاتا ہوا دوڑ کر ہمای طرف آیا۔ وہ مزدور وہیں رک گئے۔

''چھوٹے صاحب کدھر جا رہے ہیں؟''

''تمہاری ہی تلاش میں نکلا تھا منشی۔''

''جی حکم۔''

میں نے محسوس کیا کہ منشی مجھ سے نظریں ملانے سے کترا رہا ہے۔ میں نے چھیڑنے کی خاطر اسے سلام کیا۔ میرے اس سلام سے رئیس بھائی بہت محظوظ ہوئے۔ منشی بیچارہ جھینپ گیا۔

''منشی تم نے اس واقعہ کا مزدوروں سے تو ذکر نہیں کیا۔ ۔ ؟''

''نہیں چھوٹے صاحب ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مزدوروں میں یہ سنتے ہی دہشت پھیل جائے گی۔''

''ان مزدوروں کو اپنے ساتھ لے کر کہاں جا رہے تھے۔۔۔۔؟''

''پڑاؤ کی طرف۔''

''آؤ ذرا ہمارے ساتھ چلو۔ ان مزدوروں کو بھی ساتھ لے لو۔''

''کدھر چھوٹے صاحب؟''

''چشمے کی طرف۔'' رئیس بھائی نے بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔

چشمے کا نام سن کر منشی اندر ہی اندر پانی کی طرح بہہ گیا پھر اچانک اسے اپنے مرد ہونے کا احساس ہوا تو اس نے ہمت کر کے پہاڑی زبان میں ان مزدوروں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں چھوٹے صاحب کے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

مزدور خوشی خوشی ہمارے ساتھ ہو لیے۔

سب سے آگے رئیس بھائی' ان کے پیچھے میں' میرے پیچھے دو مضبوط مزدور اور درمیان میں منشی پہلے کی طرح۔ میں پلٹ کر کبھی کبھی منشی کو دیکھ لیتا تو وہ کچھ پریشان سا ہو جاتا۔ میں سوچنے لگا کہ اس جنگل میں جہاں جگہ جگہ خطرہ ہے یہ منشی کس طرح زندگی گزار رہا ہے۔ یہ زندگی بھی خوب شے ہے ہر صورت میں گزارتی ہوتی ہے۔ چاہے ڈر کر چاہے بہادری سے۔

جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں اس ریچھ انسان سے میری ملاقات ہوئی تھی تو میرے جسم پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس کا بالوں بھرا' لمبے لمبے ناخنوں والا ہاتھ مجھے اپنے کندھے پر رکھا ہوا محسوس ہوا۔ آپ ہی آپ میری گرفت بندوق پر مضبوط ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ''یہی ہے وہ جگہ۔''

رئیس بھائی نے اس جگہ کا بغور معائنہ کیا۔ تھوڑا سا اوپر چڑھ کر بھی دیکھا لیکن کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس سے اس کے وجود کا احساس ہوتا۔ ویسے زمین پتھریلی تھی اس پر قدموں کے نشان ڈھونڈنا بیکار ہی تھا۔

''کیا خیال ہے پہاڑی پر چڑھا جائے؟'' رئیس بھائی نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے تو اوپر جانا مشکل ہے۔'' میں نے دشوار گزار راہ کو دیکھا۔

''کیا آپ آسانی سے چڑھ سکیں گے۔''

''چڑھ تو جاؤں گا۔ اترنا ذرا مشکل ہوگا۔ تم ایسا کرو منشی کے ساتھ یہیں ٹھہرو میں مزدوروں کو لے کر اوپر جاتا ہوں۔''

''کیا وہ اب تک اوپر بیٹھا ہوگا؟'' میں نے خیال ظاہر کیا۔ ''بیکار ہے آپ کا اوپر جانا۔ آیئے چشمے تک ہو آتے ہیں ممکن ہے وہ ہمیں چشمے میں نہاتا ہوا مل جائے۔''

میری بات رئیس بھائی کی سمجھ میں آ گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ہم سب چشمے کی طرف چل پڑے۔ اس مرتبہ منشی میرے پیچھے آ گیا۔

پورا راستہ خیریت سے گزرا۔ چشمے پر بھی کچھ نہ تھا۔ ہر طرف پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تب اچانک ہی میری نظر چشمے کے اس پار درختوں کے جھنڈ پر پڑی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم دونوں کی بیک وقت اس پر نظر پڑی وہ بڑے سکون سے کھڑا تھا اور اسے ہماری آمد کا ابھی احساس نہ ہوا تھا۔

''گولی چلاؤ۔'' رئیس بھائی نے مجھے اشارہ کیا۔

''یہ بندوق کی زد سے باہر ہے۔ آپ چلائیں گولی۔'' میں نے اپنی بندوق کندھے سے اتارتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں اس میں حرکت ہوئی۔ وہ آہستہ روی سے آگے بڑھا۔ ابھی وہ دو چار قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ دھماکہ ہوا۔

رائفل کی نال گولی اگل چکی تھی۔

پھر میں نے اسے گرتے دیکھا۔ ساتھ ہی رئیس بھائی کا نعرہ مستانہ سنائی دیا۔ ہم سب اس طرف دوڑ پڑے۔ میں نے دیکھا کہ منشی ہم سب سے آگے ہے۔ مزدوروں سے بھی آگے۔ مزدوروں کے پیچھے رئیس بھائی تھے اور سب سے آخر میں میں۔ چشمہ پار کرتے ہوئے کئی بار پتھروں سے پھسلا پانی میں گرا۔ گرتا

پڑتا آخر چشمہ پار کر ہی گیا۔

جب میں اس کے نزدیک پہنچا تو رئیس بھائی کو چاقو' چاقو پکارتے سنا۔ پھر میں نے منشی کو اپنی واسکٹ کی جیب سے چاقو نکالتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک چھ انچ لمبا کھٹکے سے کھلنے والا رامپوری چاقو تھا۔

منشی نے بڑی پھرتی سے اسے دبوچ لیا۔ مزدوروں نے اس کی مدد کی۔ منشی نے آناً فاناً اس کے گلے پر چاقو چلا دیا۔ آخر اس کے تڑپتے جسم کو قرار آ گیا۔

گولی اس کے جسم میں پیوست ہو گئی تھی۔ زخم اتنا سخت تھا کہ وہ گولی لگنے کے بعد مشکل سے چار چھ قدم بھی نہ چل سکا۔

میں منشی کی صورت بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی منشی تھا جس کا کچھ دیر پہلے خوف سے برا حال تھا۔ اب وہی منشی کتنا بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چیتل کی کھال سے اپنا خون آلود چاقو صاف کرتے ہوئے اس کے چہرے سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ چیتل کو دیکھ کر منشی کے چہرے سے خوشی کیوں چھلکی پڑی تھی۔ اصل میں یہ سارا کرشمہ گوشت کا تھا۔ اس جنگل میں گوشت کا میسر آنا ایسا ہی تھا جیسے چیل کے گھونسلے سے ماس کا مل جانا۔

رات کو جب دستر خوان پر منشی نے چیتل کا گوشت سجایا تو اس بھنے ہوئے گوشت کو کھا کر جی خوش ہو گیا۔ منشی نے یہ گوشت بہت محنت سے پکایا تھا اور اتنا لذیذ تھا کہ میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر منشی نے بتایا کہ آج پورنماشی کی رات ہے۔ یہ پہاڑی مزدور رقص و سرود کی محفلیں جمائیں گے۔ آپ لوگ آنا چاہیں تو میں انتظام کر دوں گا۔

رئیس بھائی کو گانے بجانے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن انہوں نے میری خاطر مزدوروں کے اس جشن میں شمولیت کی حامی بھر لی۔

چاند روشن ہوتے ہی ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ ایک طرف الاؤ روشن تھا۔ الاؤ کے سامنے ایک مضبوط جسم کا پہاڑی مزدور بانسوں کے گٹھڑ پر بیٹھا ڈھول پیٹ رہا تھا اور چار مرد' چار عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر رقصاں تھے۔ ایک طرف ذرا اونچی سی جگہ پر کچھ عورتیں اور مرد بیٹھے گا رہے تھے۔ باقی عورتیں مرد اور بچے تماشائی کی حیثیت سے براجمان تھے۔ ہمارے بیٹھنے کیلئے منشی نے زمین پر گھاس کا بستر سا بچھا دیا تھا۔ میں اور رئیس بھائی خاموشی سے اس مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے۔

یہ رقص' یہ گانا بجانا میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ مجھے یہ سب کچھ فلم کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ میں بہت دلچسپی سے اس پورے منظر کو اپنی آنکھوں میں سمو رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہمیں دو پیالوں میں ایک مشروب پیش کیا گیا۔ یہ کسی پھل کا رس معلوم ہوتا تھا لیکن میں پہچان نہ سکا کہ یہ کس پھل کا رس ہے۔

ابھی ہم مشروب گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اتار ہی رہے تھے کہ منشی ہمارے قریب آیا اور رئیس بھائی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''چھوٹے صاحب! یہ لوگ آپ دونوں کو ہار پہنانا چاہتے ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''نہیں! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں' کیوں بھئی؟'' رئیس بھائی نے مجھے دیکھا۔

''ہار کون پہنائے گا'' میں نے منشی سے پوچھا۔

''دو لڑکیاں رقص کرتی ہوئی آپ کے سامنے آئیں گی اور آپ لوگوں کے گلے میں ہار ڈال کر واپس چلی جائیں گی۔ یہ ایک طرح سے عقیدت کا اظہار

ہو گا۔''

''منشی کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لڑکیاں ہمیں بر مالائیں پہنا جائیں۔ بر مالا پہنوانی ہے تو مجھ سے پہلے لڑکی پسند کروا لو تاکہ بارات واپس نہ جائے۔''

منشی کو مجھ سے ایسی بے تکلفی کی توقع نہ تھی۔ اس اچانک بے تکلفی پر وہ خاصا محظوظ ہوا۔ رئیس بھائی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

چند منٹ کے بعد وہ ڈھولک بجانے والا مزدور کھڑا ہوا اور ڈھولک بجانے کے ساتھ رقص کرتا ہوا درمیان میں آ گیا۔ وہ چار مرد اور عورتیں پیچھے ہٹ گئے لیکن رقص بدستور کرتے رہے۔

اچانک درختوں کی اوٹ سے دو چاند نمودار ہوئے اور بڑی فنکاری سے رقص کرتے ہوئے ڈھولک بجانے والے کے قریب آ گئے۔

میں نے دیکھا کہ ان چاندی بدن لڑکیوں کے ہاتھ میں پتوں کا بنا ایک ایک بے حد خوبصورت ہار ہے۔ ان ہاروں کو دونوں لڑکیوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا اور وہ بڑی تیزی سے رقص کر رہی تھیں۔

کچھ دیر رقص کرنے کے بعد وہ بجلی کی طرح کوندتی ہماری طرف لپکیں اور پلک جھپکتے ہی ہمارے گلوں میں ہار ڈال کر رقص کرتی ہوئیں درختوں کی اوٹ میں چلی گئیں۔ پتوں کے ان ہاروں سے بڑی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔

ڈھولک والا پھر اپنی جگہ جا بیٹھا اور وہ چار مرد چار عورتیں دوبارہ درمیان میں آ گئے۔ میں نے اپنے گلے سے ہار اتارنا چاہا کیونکہ نوکیلے پتے میری گردن میں چبھ رہے تھے تو رئیس بھائی نے مجھے روک دیا۔

''کیا کرتے ہو؟'' ان کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

''ہار اتار رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ایسا غضب نہ کرنا ورنہ ہنگامہ ہو جائے گا۔''

''کیسا ہنگامہ۔'' میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''یہ توہم پرست لوگ ہیں۔ تم ہار اتارو گے یہ اسے بدشگونی سمجھیں گے اور صبح ہی ان کی تمام جھونپڑیاں خالی ہو جائیں گی۔''

''یہ کام چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں' بدشگونی کی جگہ ان کا رہنا ممکن نہ ہو گا۔''

''کمال ہے۔'' میں نے پتے کی نوک کو اپنے گلے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''کیا رات کو بھی اسے گلے میں ہی ڈال کر سونا ہو گا۔''

''بالکل۔'' رئیس بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''رات ہی کو کیا اب تو یہ مستقل تمہارے گلے میں پڑا رہے گا۔ جب تک تم اس جنگل کی حدود سے نکل نہیں جاتے۔''

''جی ہاں۔'' ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو میرے گلے میں بری طرح چبھ رہا ہے۔ کم بختوں کو کوئی اور پتے نہیں ملے ہار بنانے کیلئے۔''

''اچھا یہ بتاؤ کچھ دیر اور بیٹھنا ہے یہاں' یا چلنا ہے۔''

''بس چلیں۔''

ہمیں اٹھتا دیکھ کر منشی ہمارے پاس دوڑا چلا آیا۔ ''چل دیئے صاحب۔''

''ہاں بھئی۔ اب تو نیند آنے لگی ہے۔'' یہ کہہ کر رئیس بھائی نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور منشی کو دیتے ہوئے بولے۔ ''میری طرف سے ان لڑکیوں کو انعام۔''

''چھوٹے صاحب ! میں ان لڑکیوں کو بلاتا ہوں۔ یہ انعام آپ خود اپنے ہاتھوں سے انہیں دے دیں۔'' یہ کہہ کر منشی نے ہاتھ اٹھا کر ایک زوردار چیخ ماری۔ میرے نزدیک وہ چیخ ہی تھی۔ ویسے اس نے پہاڑی میں رقص روکنے کو کہا تھا۔

منشی کی آواز سنتے ہی ڈھولک کی آواز معدوم ہوگئی' رقص تھم گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہر شخص پتھر کا بن گیا ہو۔ پھر منشی نے ڈھولک والے سے کچھ کہا۔ ڈھولک والے نے منشی کی بات سن کر کسی کو آواز دی۔ تب میں نے پھر سے درختوں کے جھنڈ ے سے دو چاندوں کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ دونوں لڑکیاں خاموشی سے ڈھولک والے کے نزدیک آ کر کھڑی ہوگئیں۔

منشی نے پھر ڈھولک والے سے ان کی زبان میں کچھ کہا۔ شاید مالک کی جانب سے انعام دینے کا اعلان کیا۔ جواباً ڈھولک والا اس انداز سے کھڑا ہوا جیسے کہتا ہو' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

میرا قیاس سو فیصد صحیح نکلا۔ ان غریب مزدوروں نے وہ روپے لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی غربت میں کس قدر عظمت تھی۔ وہ اپنے مالک کی عقیدت بے لوث کرنا چاہتے تھے۔ وہ مالک کو اپنے دیوتا سمان سمجھتے تھے۔

اپنی جھونپڑی میں آ کر میں نے وہ پتوں کا ہار اتار پھینکا اور رئیس بھائی سے کل کا پروگرام طے کر کے محو خواب ہوگیا۔

دوسرے دن ہم لوگوں نے یہاں سے دس میل دور ایک دوسرے ٹھیکیدار کے پاس جانا تھا۔ وہ ٹھیکیدار چچا جان کے دوست تھے' انہوں نے ہم لوگوں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا۔ ساتھ ہی کچھ شکار کا پروگرام تھا۔

صبح ہم دونوں ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ رائفل اور بندوق ہمارے ساتھ تھیں۔ جیپ تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہ لگی۔ رئیس بھائی نے گاڑی سٹارٹ کی اور ہم پتلی سی سڑک پر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یہ سڑک ہموار نہ تھی۔ چلتے چلتے اچانک چڑھائی آ جاتی اور پھر ڈھلان اس کے بعد کچھ دیر سطح ہموار رہتی۔ یہ سڑک جنگل کا سینہ صاف کر کے نکالی گئی تھی۔ دونوں طرف گھنا جنگل تھا اور سڑک ایک دم سنسان تھی۔ رئیس بھائی

خلاف توقع بڑی دھیمی رفتار سے چل رہے تھے۔ شاید جنگل کی صبح کا لطف لے رہے تھے۔

میں دائیں بائیں دونوں طرف نظریں رکھے ہوئے تھا تاکہ کوئی شکار نظر آئے تو کر لیا جائے۔ رئیس بھائی ان ٹھیکیدار صاحب کا حسب و نسب بیان کر رہے تھے جنہوں نے ہمیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ بات کرتے کرتے رئیس بھائی نے بریک پر پاؤں مارا۔ گاڑی رکی تو وہ اپنی رائفل سنبھال کر بائیں جانب درختوں میں متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''کیا ہے؟'' میں نے بھی اپنی بندوق پر گرفت مضبوط کر لی۔

''کوئی جانور تھا۔''

''کس طرف۔''

''وہ سامنے درختوں میں۔'' رئیس بھائی نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ''ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی' شاید چیتل ہے۔''

''کس طرف۔''

''آئیے نیچے اتر کر دیکھیں۔''

''نہیں.... ایک منٹ انتظار کرو ممکن ہے میرا شبہ ہی ہو۔'' رئیس بھائی بدستور ان درختوں پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔

باوجود کوشش کے مجھے ان درختوں میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے میں پوری طرح چوکس تھا۔ کھلی جیپ سے بیٹھے بیٹھے نشانہ لگانا مشکل نہ تھا' صرف شکار دکھائی دے جانے کی دیر تھی۔

اچانک رئیس بھائی نے حفاظتی کھٹکا ہٹا کر شست باندھی۔ مجھے بھی درختوں میں کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے کھٹاکھٹ بندوق کے گھوڑے چڑھائے اور ٹریگر پر انگلیاں جما کر فائر کرنے کیلئے تیار ہوگیا۔

''ہت تیری کی۔'' رئیس بھائی نے بے اختیار اپنا سر پیٹ لیا۔

جب میری نظر درختوں پر پڑی تو مسکرائے بنا میں بھی نہ رہ سکا۔ ایک جنگلی کتا درختوں سے نکل کر باہر آیا اور سڑک کراس کرتا ہوا پھر درختوں میں گم ہو گیا۔

''جنگل میں یوں بھی ہوتا ہے۔'' رئیس بھائی نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں جنگل میں یوں بھی ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ میری بات سن کر رئیس بھائی مسکرا دیے۔

اب گاڑی نے فراٹے بھرنا شروع کر دیے تھے اور میں اپنی بندوق سنبھالے درختوں کے پیچھے جھانکتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ رئیس بھائی خلاف توقع چپ تھے۔

ابھی ہم مشکل سے چار پانچ میل آگے گئے ہوں گے کہ ایک خلاف توقع بات ہوگئی۔ ایک جگہ میں نے ایک درخت کے پیچھے سے جھانکتا ہوا اسے دیکھ لیا۔

''رئیس بھائی گاڑی روکیے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

گاڑی سپیڈ میں تھی، رکتے رکتے رکی اور خاصا آگے نکل گئی۔

''کیا ہوا؟'' رئیس بھائی نے رائفل سنبھالتے ہوئے کہا۔

''وہ وہاں ہے۔'' میں نے پیچھے درختوں میں اشارہ کیا۔

''کون بھائی؟''

''وہ ریچھ انسان۔'' میری آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

''کدھر ہے آؤ میرے ساتھ۔'' رئیس بھائی گاڑی سے اچھل کر کودے۔

پھر رئیس بھائی آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ جب ہم دوڑتے ہوئے اس درخت کے سامنے پہنچے جس کی اوٹ میں وہ ریچھ انسان کھڑا تھا تو وہاں ہمیں کچھ نظر نہ آیا۔

ہم بہت محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے جنگل میں داخل ہوئے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ یہ میرے لیے ایک غیر معمولی تجربہ تھا۔

اس درخت کے نزدیک پہنچ کر ہم نے دور دور جہاں تک نظریں دوڑا سکتے تھے نظریں دوڑائیں لیکن اس عفریت کی صورت کہیں نہ دکھائی دی۔

پھر ہم لوگ اندازے سے ایک طرف چل دیئے۔ بعض وقت چھٹی حس بھی خوب کام کرتی ہے۔ ہم لوگ اس کی تلاش میں زیادہ آگے نہ گئے ہوں گے کہ اچانک میری نظر اس پر پڑ گئی۔

وہ ایک درخت کے مضبوط گدے پر بیٹھا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی اور وہ میرے نشانے پر تھا۔ رئیس بھائی مجھ سے آگے تھے۔ مجھے رکتا دیکھ کر مجھ سے اشارے سے پوچھا میں نے انہیں خاموشی سے اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔

اتنے میں اس ریچھ انسان نے حرکت کی اور اس سے پہلے کہ وہ میری زد سے باہر ہوتا میں نے بڑی پھرتی سے اس کا نشانہ لیا۔

پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟

کوئی وزنی چیز میرے اوپر گری اور بندوق میرے ہاتھ سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

بندوق کچھ اس طرح میرے ہاتھ سے نکلی کہ فائر ہو نہ سکا بس چند لمحوں کی کسر رہ گئی۔ وہ وزنی چیز اگر میرے اوپر نہ گری ہوتی تو بندوق سے گولی نکل کر اپنا کام دکھا چکی ہوتی۔

پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ یہ کیا چیز میرے اوپر گری۔ گرتے گرتے یہ خیال آیا کہ کہیں چشم زدن میں وہ عفریت ہی مجھ پر حملہ آور تو نہیں ہو گیا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ اس کی آمد میری آنکھوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

زمین پر گرنے کے بعد میں نے جیسے ہی گردن اٹھائی تو اسے بندوق ہاتھ میں دبائے بڑی پھرتی سے درخت پر چڑھتے دیکھا۔ اسے دیکھ کر اچانک میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ایک قد آور لنگور تھا جو میری بندوق اپنے قبضے میں کیے درخت پر بیٹھا کھوں' کھوں کر رہا تھا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا رئیس بھائی موجود نہ تھے۔ میں نے تیزی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہ مجھے کہیں نہ دکھائی دیئے۔ شاید وہ اس عفریت کے پیچھے چلے گئے۔

میرے لئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ اس لنگور سے اپنی بندوق حاصل کرنا تھا جو بڑے مزے سے اس کے معائنے میں مصروف تھا۔

میں نے منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکال کر اسے ڈرانا چاہا۔ شاید آوازوں کے خوف سے اس کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ جائے۔ اس نے میرے منہ سے نکلتی خوفناک آوازوں کو پوری دلچسپی سے سنا اور پھر اچھل کر مزید اوپر جا بیٹھا۔

بندوق اس نے کچھ اس انداز سے پکڑی ہوئی تھی کہ مجھے بھاگ کر ایک درخت کے پیچھے پناہ لینی پڑی۔ بندوق کے دونوں گھوڑے اٹھے ہوئے تھے اور اس کی نال کا رخ اچانک میری طرف ہو گیا تھا اور ٹریگر پر دباؤ پڑنے سے گولی چل سکتی تھی۔

لنگور کے ہاتھ بندوق آ گئی تھی' وہ اسے بڑی تیزی سے الٹ پلٹ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ نال کا رخ اگر میری طرف ہو جاتا تو میں فوراً درخت کے پیچھے پناہ لیتا اور رخ تبدیل ہونے پر باہر آ جاتا اور اپنی بندوق حاصل کرنے کی تدبیر کرنے لگتا۔ ایک تماشہ سا بن گیا تھا۔

تنگ آ کر میں نے قریب پڑا ایک پتھر اس کی طرف اچھالا اور اپنی طرف پتھر آتا دیکھ کر اس نے کھوں' کھوں کر کے ایک قدرے اونچے درخت پر چھلانگ لگا دی اور پھر مزے سے بیٹھ کر لگا بندوق کا معائنہ کرنے۔

میں نے پتھر بازی سے فوراً احتراز کیا۔ ابھی تو وہ سامنے ہی بیٹھا تھا۔ امید تھی کہ شاید کسی وقت اس کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ جائے۔ اگر پتھروں کے ڈر سے کہیں چھپت ہو گیا تو اس جنگل میں اس کا ڈھونڈ نکالنا آسان نہ ہو گا لہٰذا صبر کر کے میں زمین پر بیٹھ گیا' اس طرح کہ نال کا رخ اپنی طرف ہونے کی صورت میں تنے کے پیچھے جانا آسان ہو۔ دل میں دعا مانگنے لگا یا اللہ اس جانور کو عقل سلیم عطا فرما۔

بیس پچیس منٹ اسی طرح ایک دوسرے کی نگرانی کرتے ہوئے گزر

گئے۔ اس عرصے میں ایک مرتبہ اس کے ہاتھ سے بندوق پھسلی لیکن اس نے فوراً ہی اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ کئی دفعہ بندوق کا رخ میری طرف ہوا۔ مجھے فوراً اوٹ میں جانا پڑا۔ میری پریشانی میں اب اضافہ ہونے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لنگور سے اپنی بندوق کس طرح حاصل کروں۔ ایک ذرا سا اطمینان یہ تھا کہ اس نے بڑی درویشانہ طبیعت پائی تھی۔ میری طرف سے کچھ چھیڑ چھاڑ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بڑے آرام سے ایک جگہ جما بیٹھا تھا۔

چند لمحوں بعد مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو رئیس بھائی کو اپنے پیچھے پایا۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ سے اس لنگور کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ ہے۔''

رئیس بھائی اس صورتحال سے خاصے محظوظ ہوئے اور مجھے وہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود بڑے معصومانہ انداز میں رائفل کندھے پر لٹکائے ایک طرف کو چلے گئے۔ لنگور نے پہلے تو بڑے غور سے رئیس بھائی کی طرف دیکھا' پھر انہیں بے ضرر جان کر بندوق سے کھیلنے میں مشغول ہو گیا۔ اس اثناء میں گاہے گاہے میں شور مچاتا رہا تاکہ لنگور کی توجہ مجھ پر مرکوز رہے۔

دو تین منٹ بعد ہی فائر کی آواز آئی اور میں نے لنگور کو مع بندوق کے زمین پر آتے دیکھا۔

لنگور زمین پر گرتے ہی چند قدم تیزی سے دوڑا اور پھر ایسا گرا کہ اٹھ نہ سکا۔ ہم جب تک اس کے پاس دوڑ کر پہنچتے وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ رائفل کی گولی اس کا بھیجا چیر گئی تھی۔

''اس لنگور کے بچے نے کام خراب کر دیا۔ پتہ نہیں کہاں سے کود پڑا۔'' میں نے اس کے مردہ جسم کو جوتے کی نوک سے پیٹتے ہوئے کہا۔

''اس لنگور کے تمہارے اوپر گرتے ہی وہ عفریت چونک اٹھا۔ اس نے

پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے درختوں میں گم ہو گیا۔ میں نے درختوں میں دور تک اسے تلاش کیا مگر اس کا نشان تک نہ ملا۔ اس نے بلا کی پھرتی دکھائی۔'' رئیس بھائی نے اپنی روداد سنائی۔

''اب تو آپ کو میری بات پر یقین آ گیا۔ میں نے اپنی بندوق کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ایسا ویسا یقین۔ میں تو حیران رہ گیا ہوں۔ اگرچہ میں نے دور ہی سے اس کی ہلکی سی جھلک دیکھی ہے لیکن اس جھلک نے ہی مجھے پریشان کر دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا بلا ہے۔

''آیئے اب گاڑی کی طرف چلیں۔'' میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

پھر ہم دونوں بہت محتاط انداز سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جنگل سے نکل آئے اور جیپ میں بیٹھ کر منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ٹھکانے پر پہنچے تو ٹھیکیدار علی بخش کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کو گلے سے لگایا' پیٹھ پر تھپکی دی اور چچا جان کی خیریت معلوم کی۔ بیٹھتے ہی کچھ کھانے پینے کا انتظام ہو گیا۔ ہم دونوں بے تکلفی سے کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔

''علی چچا آپ نے کچھ سنا ہے۔'' رئیس نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا۔

''کس بارے میں بیٹے۔'' وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولے۔

''جنگل میں کسی خوفناک چیز کے وارد ہونے کے بارے میں۔''

''نہیں۔'' میں نے تو نہیں سنا...... ویسے قصہ کیا ہے۔ کوئی شیر دیر لاگو ہو گیا کیا۔'' ٹھیکیدار علی بخش نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''نہیں...... جنگل میں ایک ایسی بلا آ گئی ہے اگر آپ کے مزدور دیکھ

لیں تو کٹائی کیلئے جنگل میں نہ جائیں۔''

''ہیں۔'' ٹھیکیدار علی بخش نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ایسی کیا چیز آ گئی جنگل میں۔''

''ریچھ......''

''لاحول ولا...... ارے ریچھ سے کون ڈرے گا۔'' رئیس بھائی کی بات مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ علی بخش نے ٹوک دیا۔

''اگر ریچھ کا قد نو فٹ ہو اور چہرہ انسانوں جیسا ہو تو پھر اس بلا سے کون نہیں ڈرے گا۔'' رئیس بھائی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ' تمہارا مطلب بن مانس سے لیکن اس علاقے میں بن مانس تو نہیں پائے جاتے۔''

''جی میرا مطلب ہرگز بن مانس سے نہیں ہے۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس علاقے میں کون کون سے جانور پائے جاتے ہیں۔ میں تو ریچھ کا ذکر کر رہا ہوں جو انسانوں کی شکل کا ہے۔''

''انسانوں کی شکل کا...... بھئی کیا کہہ رہے ہو۔'' ٹھیکیدار علی بخش نے مونچھوں پر تاؤ دینا چھوڑ دیا۔

''جی ہاں۔'' انسان جیسی شکل کا...... اب آپ اسے انسان نما ریچھ کہہ لیں یا ریچھ نما انسان...... آپ کوئی بھی نام دے لیں لیکن یہ سوچ لیں کہ وہ ہمارے اور آپ کے جنگلات کی حدود میں موجود ہے اور کسی مزدور کی اب تک اس پر نظر نہیں پڑی ہے۔''

''بھئی ! یہ تو تم نے بڑی فکر والی بات سنا دی۔ ذرا تفصیل تو بتاؤ کہ تم نے اس ریچھ انسان کو کہاں دیکھا۔''

''بس ابھی ملاقات کر کے آ رہے ہیں' اس سے۔'' یہ کہہ کر رئیس بھائی

نے پوری روداد ان کے گوش گزار کر دی۔

رئیس بھائی کے بعد مجھے بھی اپنی آپ بیتی سنانی پڑی اور میں نے کچھ اس انداز سے آپ بیتی سنائی کہ ٹھیکیدار علی بخش پر لرزا طاری ہو گیا۔ انہوں نے فوراً ہی اپنے دونوں بیٹوں کرم الٰہی اور فضل الٰہی کو بلوا بھیجا جو اوپر کہیں کٹائی کی نگرانی میں مصروف تھے۔

دوپہر کھانے پر کام و دہن کی ''آزمائش'' کے دوران اس عفریت سے جنگل پاک کرنے کا پروگرام مرتب ہوتا رہا۔ شکار پارٹی میں کون کون لوگ شامل ہوں گے۔ کس کس سے مدد لی جائے گی اور کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔ یہ سب باتیں اور اسی طرح کی دوسری متعلقہ باتوں پر اچھی طرح غور کر لینے کے بعد ایک جامع لائحہ عمل طے کر لیا گیا۔

کھانے کے بعد جب ہم لوگ ہاتھ میں کپ پکڑے مزے دار چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو اس دوران ٹھیکیدار علی بخش نے حیرت میں ڈالنے والا واقعہ سنایا۔ بات اصل میں شروع ہوئی تھی سورج بابا سے جو آج مزدوروں کی بستی وارد ہونے والے تھے اور یہ موقع مزدوروں کیلئے کسی دیوالی سے کم نہ تھا' مزدوروں کی بستی میں آج گھر گھر چراغاں ہونے والا تھا۔ گھر گھر جشن منایا جانے والا تھا۔

سورج بابا آج بارہ برس بعد جنگل سے نکل کر انسانوں کے درمیان آ رہے تھے اور وہ بھی چند گھنٹوں کیلئے یہ ان کا معمول تھا' وہ ہر بارہویں برس بستی میں وارد ہوتے مزدوروں کے ساتھ چند گھنٹے گزارتے اور پھر بن باس لے لیتے۔ جنگل میں انہوں نے کہاں قیام کیا ہوا تھا اور درندوں کی اس بستی میں وہ کیسے زندہ تھے' اس سے کوئی واقف نہ تھا۔

سورج بابا کا ذکر سن کر میرے دل میں خواہش جاگی کہ اس عجوبہ کو دیکھنا

چاہیے۔ میں نے رئیس بھائی سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ بلا پس و پیش اس
سنیاسی کی جھلک دکھانے کیلئے راضی ہو گئے۔

ابھی ہم لوگ مزدوروں کی بستی جانے کا پروگرام طے کر رہے تھے کہ
ٹھیکیدار علی بخش نے رئیس بھائی سے مخاطب ہو کر کہا بیٹے' مزدوروں کی بستی جاؤ تو
انہیں بابا کے چیلے کی کٹیا ضرور دکھانا۔''

''یہ بابا کا چیلا کون ہے؟'' میں نے ٹھیکیدار علی بخش سے راست سوال
کیا۔

تب انہوں نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر وہ حیرت میں ڈالنے والا
واقعہ سنایا۔ کہنے لگے۔'' یہ چیلا بستی سے الگ ایک کٹیا میں مقیم تھا۔ یہ سورج بابا کا
چیلا تھا لہٰذا بستی کے لوگوں میں یہ بابا کا چیلا کے نام سے مشہور تھا۔ کہتے ہیں کہ
بابا کا یہ چیلا سورج بابا کے ساتھ جنگل میں کئی برس تک رہا تھا۔ ان ہی سے اس
نے گیان دھیان کی باتیں سیکھی تھیں اور ریاضت سے چند باطنی قوتیں حاصل کر لی
تھیں اور ان باطنی قوتوں کی وجہ سے وہ بستی کے مزدوروں کا بے تاج بادشاہ تھا۔
کہتے ہیں کہ اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے کی وجہ سے مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ اس
کے سانپ بچھو کے کاٹنے کا علاج بھی موجود تھا۔ غرض اس نے مزدوروں کی اس
بستی پر سحر کر رکھا تھا۔ بستی کے کسی باسی کو اس کے حکم کی سرتابی کرنے کی جرأت نہ
تھی۔ بابا کا چیلا جنگل سے پلٹنے کے بعد ابتدائی سالوں میں نیک باطنی اختیار کیے
رہا۔ جب پوری بستی اس کے زیر اثر آ گئی اور اس کے منہ سے نکلا ہر لفظ حکم کا
درجہ اختیار کر گیا تو وہ بدباطنی پر اتر آیا۔ نیک نفسی سیلاب کے پانی کی طرح بہہ
گئی۔ ساری ریاضت اکارت گئی۔ سورج بابا کی محنت مٹی میں مل گئی۔ وہ چوری
چھپے بستی کی عورتوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ بری باتیں زیادہ عرصے پوشیدہ نہیں
رہتیں۔ جب ہوس کی داستانیں حد سے بڑھیں تو بستی کے بڑے بوڑھوں نے

آنکھیں کھول کر دیکھا' ان کے سامنے گناہ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سب کچھ
جاننے اور سب کچھ دیکھنے کے باوجود کسی میں اس گناہ کے دیوتا کے سامنے سر
اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ ایک آدھ نے جرأت سے کام لے کر اس کیخلاف اٹھنا
بھی چاہا' تو اس نے اپنی باطنی قوتوں سے کام لے کر معصوم زبانوں سے قوت
گویائی چھین لی۔ آخر ظلم اپنی حدوں کو چھونے لگا اور وہ دن آ پہنچا جسے یوم حساب
کہا جاتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک مزدور لڑکی' اپنے چھوٹے بھائی کو نیچے چھوڑ کر خود
اوپر جنگل میں بانسوں کا گٹھڑ اٹھانے چلی گئی۔ جب وہ اوپر سے واپس آئی تو اس
نے اپنے تین چار سالہ بھائی کو تڑپتے ہوئے دیکھا۔ اس کی ٹانگ پر ایک ناگ
نے کاٹ لیا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگوں کا طوفان امڈا چلا آ رہا تھا۔ لڑکی یہ دیکھ
کر گھبرا گئی۔ اس نے اپنے سر سے بانسوں کا گٹھڑ پھینکا اور اپنے بھائی کو کندھے پر
ڈال کر آندھی طوفان کی طرح نیچے اترنے لگی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل
چھائے ہوئے تھے۔ راستہ دشوار گزار اور بابا کے چیلے کی کٹیا خاصے فاصلے پر تھی۔
اس نے ہمت نہ ہاری وہ پتھروں پر ٹھوکریں لگاتی موج بلا کی طرح بڑھتی رہی۔
ابھی زیادہ فاصلہ نہ طے کیا تھا کہ بارش نے آ گھیرا اور بارش بھی موسلا دھار'
پتھریلے راستوں پر چلنا ویسے ہی کیا کم دشوار تھا کہ بارش نے اور پھسلن پیدا کر
دی۔ بالآخر گرتی پڑتی وہ بابا کے چیلے کی کٹیا تک پہنچ ہی گئی۔ ایسے سلگتے موسم میں
ایک بھرپور لڑکی کی آمد کسی مندر کے ''پرشاد'' سے کم نہ تھی۔ بابا کا چیلا انگڑائی لے
کر اٹھ بیٹھا۔ اس لڑکی نے اپنے بھائی کو کندھے سے اتار کر زمین پر لٹایا اور ملتجی
نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''سوامی جی' میرے بھائی کو بچا لیں
اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔

لیکن بابا کے چیلے نے اس بچے کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کی۔ وہ اس
لڑکی کے بھیگے بدن کو پرشوق نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔''ارے تم تو ساری بھیگ

گئی ہو جاؤ اندر جا کر اپنے جسم سے چادر لپیٹ لو۔"

"سوامی جی میری فکر نہ کریں وہ پتھر نکال کر میرے بھائی کی ٹانگ پر رکھ دیں تاکہ وہ اس کا زہر چوس لے۔" لڑکی نے بے حد پریشانی سے کہا۔

"ہاں' میں نکالتا ہوں پتھر..... تم اپنے کپڑے تبدیل کرو۔ نہیں تو بخار چڑھ جائے گا۔" بابا کا چیلا بدستور لڑکی کے گرد نظروں کا حصار بنائے ہوئے تھا۔

لڑکی کے بھائی کے منہ سے جھاگ بدستور جاری تھی۔ اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی اور وہ وقت زیادہ دور نہیں تھا جب زہر کو رگ رگ میں اتر جانا تھا۔

لڑکی نے جھک کر اپنے بھائی کے منہ سے جھاگ صاف کیے اور بابا کے چیلے کی طرف بے قراری سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "سوامی جی جلدی کریں۔"

"کنیا..... دھیرج رکھ' میرے ہوتے ہوئے تیرے بھائی کو کچھ نہیں ہو گا۔" یہ کہہ کر بابا کے چیلے نے ایک کونے میں پڑا لکڑی کا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک ریشمی چادر نکال کر اس کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ "جا اندر جا کر اسے لپیٹ لے بھیگے کپڑے زیادہ دیر بدن پر رہے تو سردی چڑھ جائے گی۔"

لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے چادر کو تھام لیا اور تذبذب کے عالم میں بابا کے چیلے کو دیکھنے لگی۔ اس نے لڑکی کو نظر انداز کرتے ہوئے لکڑی کا صندوق پھر کھولا اور اس میں سے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا۔ اس ڈبے میں وہ پتھر بند تھا جو زہر چوس لیا کرتا تھا۔

بابا کے چیلے نے ڈبہ کھولا اور وہ پتھر نکال کر اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر بولا۔ "جا تو اندر جا کر کپڑے بدل میں جب تک تیرے بھائی کو ٹھیک کرتا ہوں۔"

بابا کے چیلے کے ہاتھ میں پتھر دیکھ کر اس لڑکی کے چہرے پر یکلخت مسرت پھیل گئی اور وہ کپڑے تبدیل کرنے اندر بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ کنیا کے اس

اندرونی حصے کو بابا کا چیلا خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ یہاں زمین پر ایک نہایت آرام دہ بستر لگا ہوا تھا۔ لڑکی نے بغور اس حصے کا جائزہ لیا اور کپڑے تبدیل کرنے سے پہلے بے چین ہو کر دروازے پر بھاگی۔ اس نے دروازے سے باہر جھانکا تو بابا کے چیلے کو بھائی کے اوپر جھکا ہوا پایا۔ ادھر سے مطمئن ہو کر وہ تیزی سے پلٹی اور ایک کونے میں کھڑی ہو کر بھیگے کپڑے اپنے بدن سے جدا کرنے لگی۔ یکایک اسے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ ابھی اس نے اپنے کپکپائے جسم پر چادر بھی اچھی طرح نہ اوڑھی تھی کہ دروازے پر پھنکار سنائی دی۔ لڑکی نے گھبرا کر دروازے پر نگاہ کی تو اس نے بابا کے چیلے کو سانپ کے روپ میں پایا جو اپنا پھن پھیلائے ہوس کی زبان نکالے دروازے پر جھوم رہا تھا۔

"سوامی جی!" لڑکی نے جلدی سے اپنے گرد چادر لپیٹ لی اور پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہو گیا' میرا بھائی۔"

"ہاں' بالکل ٹھیک۔" بابا کے چیلے نے بدستور جھومتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے وہ؟" لڑکی دروازے کے اس پار دیکھتے ہوئے بولی۔

"آکاش پر....." اس نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

"کیا مطلب..... ؟" لڑکی کی روح میں سناٹا اترنے لگا۔

"مر گیا وہ۔ تو نے لانے میں دیر کر دی۔"

"اوہ نہیں وہ میری زندگی کا سہارا تھا۔ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف آئی اور اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ دروازے پر ہوس کا سانپ پہلے ہی کنڈلی مارے بیٹھا تھا اس نے اس لڑکی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے جسم کو ڈسنے لگا۔

تب ہی دور پہاڑوں پر بجلی کڑکی اور دھماکے ہونے لگے۔ ظلم حد سے باہر ہوا تو عذاب آ پہنچا۔ ہوس کا سانپ ابھی اس لڑکی کے کنوارے بدن پر اپنا

زہر پھیلا نہ پایا تھا کہ چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ بابا کے چیلے کی تھی۔ لڑکی نے اچانک اسے زمین پر تڑپتے ہوئے دیکھا' ایک بہت بڑا کالا ناگ اس کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ لڑکی سہم کر ایک کونے میں ہوگئی اور اس نے اپنے برہنہ جسم کو چادر سے اچھی طرح ڈھانک لیا۔ وہ کالا ناگ بابا کے چیلے کے جسم سے لپٹا اسے جگہ جگہ سے ڈس رہا تھا اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کٹیا میں خاموشی چھا گئی۔ باہر آسمان بھی گرج چمک کر چپ ہو گیا تھا۔ فضا میں ایک پرسکون سناٹا طاری تھا۔ بابا کے چیلے کا پورا جسم نیلا پڑ چکا تھا۔ چہرے پر کرب کے آثار ابھی تک نمایاں تھے۔ اس کی مٹھی میں زہر کا تریاق موجود تھا لیکن مٹھی کھول کر اس کو زخم پر رکھنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ گناہ کا دیوتا اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا اور کالا ناگ پھنکارتا کب کا دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔ لڑکی نے ڈرتے ڈرتے قدم باہر نکالا جیسے ہی اس کی نظر اپنے بھائی پر پڑی تو وہ سناٹے میں آ گئی۔ وہ کالا ناگ اس کے بھائی کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا اور اس نے اس کے زخم پر منہ رکھا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر لڑکی کے جسم پر لرزا طاری ہو گیا۔ وہ سمٹ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر وہ کالا ناگ اسی طرح اس کے زخم پر منہ رکھے رہا' پھر دھیرے سے اس کی ٹانگ سے اتر کر ایک کونے میں غائب ہو گیا۔ لڑکی تڑپ کر اپنے بھائی کی لاش کی طرف بڑھی۔ اسی وقت اس کے بھائی نے کروٹ لی اور اس طرح مسکراتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ لڑکی نے فوراً اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑا اور بھگوان کا شکر ادا کرتی شیطان کی کٹیا سے بھاگی جس نے اس کی عزت اور بھائی کی جان بچا لی تھی۔ اس لڑکی نے بستی کے لوگوں کو اکٹھا کر کے بابا کے چیلے کے پرلوک سدھارنے کی اطلاع دی اور اس کے کرتوت کا کچا چٹھا کھولا تو گونگی بستی کو زبان مل گئی۔ ہر زبان اس کے ظلم کی داستان کہنے لگی۔ لوگ غصے میں بپھرے ہوئے اس کی کٹیا کی طرف بڑھے اور اس کی لاش کھینچ کر باہر

نکال لائے۔ ان کا ارادہ اس کی لاش کو اسی طرح ٹانگ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بستی میں لے جانے کا تھا تاکہ اس کی لاش سے انتقام کی آگ بجھائی جا سکے لیکن وہ ابھی اس کی لاش کو کٹیا سے باہر ہی لائے تھے کہ کہیں سے اچانک وہ کالا ناگ پھنکارتا ہوا برآمد ہو گیا۔ کالے ناگ کو دیکھتے ہی سارے لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ چکر دو تین دن تک اسی طرح چلتا رہا۔ بستی کے لوگ بابا کے چیلے کی لاش وہاں سے نکال لے جانے کیلئے آتے کہ کہیں سے اچانک وہ کالا ناگ پھنکارتا ہوا نمودار ہو جاتا اور لوگوں کو وہاں سے بھاگتے ہی بنتی۔ پھر کسی طرح لوگوں کے دلوں میں یہ بات آ گئی کہ کالا ناگ اس لاش کا محافظ ہے' وہ نہیں چاہتا کہ لاش یہاں سے جائے۔ بالآخر ناگ دیوتا کی مرضی کے آگے سب نے سر جھکا دیا اور یوں یہ لاش قابل عبرت بنا دی گئی۔ یہ کہہ کر ٹھیکیدار علی بخش نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر اسے زمین پر پھینکا اور جوتے کی ایڑی سے رگڑ دیا۔

اس عجیب وغریب واقعہ سے میں خاصا متاثر ہوا۔ چند لمحوں تک کوئی کچھ نہ بولا۔ شاید ہر شخص برے کام کے انجام پر غور کر رہا تھا۔

''اس واقعہ کو کتنا عرصہ ہوا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ چھبیس سال پرانا واقعہ ہے۔'' ٹھیکیدار علی بخش نے جواب دیا۔

''کیا وہ لاش ابھی تک وہاں موجود ہے۔''

''بالکل اور روز اول کی طرح تازہ جیسے چند گھنٹوں پہلے اس شیطان کی موت واقع ہوئی ہو۔''

''یہ کیسے ممکن ہے لاش کی صورت تو دو تین دن میں ہی بگڑ جاتی ہے۔ کہاں چھبیس سال؟''

''اسی لیے میں نے رئیس سے کہا ہے کہ وہ تمہیں اس عجوبہ جگہ کو ضرور دکھائے۔ جب تم اپنی آنکھوں سے اس لاش کو دیکھو گے تو پھر یقین کیے بنا کوئی

چارہ نہ رہے گا۔'' ٹھیکیدار علی بخش نے بڑے یقین سے کہا۔

اس قصے نے مجھے بے چین کر دیا اور ہمارے پاس مزدوروں کی بستی میں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

ٹھیکیدار علی بخش سے جب ہم نے اجازت لے کر بستی کی طرف چلنے کا قصد کیا تو کرم الٰہی اور فضل الٰہی بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ باپ نے ان دونوں کو اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹنے کی ہدایت کی اور وہ دونوں بڑی سعادت مندی سے گردن ہلاتے ہوئے ہمارے ساتھ چل پڑے۔

کچھ دیر بعد دو جیپیں آگے پیچھے سڑک پر اڑی جا رہی تھیں۔

راستے میں ہم دونوں نے آنکھیں کھلی رکھیں لیکن کوئی قابل دید چیز نظر نہ آئی۔

جب ہم لوگ مزدوروں کی بستی میں پہنچے تو وہاں میلے کا سا احساس ہوا۔ ہر طرف بڑی رونق تھی۔ لوگ رنگ برنگے کپڑے پہنے' گلوں میں پتوں کے ہار ڈالے ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر خوشی تھی۔ بچے اچھل کود رہے تھے اور عورتیں کھانے پینے کی اشیاء کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ اس بستی میں چھوٹی چھوٹی دکانیں مختلف چیزوں کی لگی ہوئی تھیں اور ان دکانداروں پر گاہکوں کی خاصی بھیڑ تھی۔

بستی کے اندر پتھروں کا ایک بڑا سا چبوترا بنا ہوا تھا اور اس چبوترے کو درختوں کے پتوں اور بانسوں سے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ شاید یہ سٹیج سورج بابا کیلئے بنایا گیا تھا۔ بستی میں مختلف لوگوں سے ہم نے سورج بابا کی آمد کا وقت معلوم کیا لیکن کسی کو بھی ان کی آمد کا صحیح وقت معلوم نہ تھا۔ ویسے لوگوں کی توقع یہی تھی کہ وہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے آ جائیں گے۔

سورج بابا کے چیلے کی کٹیا بستی سے الگ ذرا اونچائی پر درختوں کی اوٹ

میں تھی۔ یہ کٹیا ایسی جگہ پر تھی جہاں سے وہ پوری بستی پر نظر رکھ سکتا تھا لیکن بستی سے اس پر نظر رکھنا آسان نہ تھا۔ شاید اسی تنہائی نے اسے گناہ کے راستے پر ڈال دیا تھا۔

بستی سے رہبری کیلئے ہم نے ایک بزرگ سا آدمی لے لیا تھا جو سر جھکائے ہمارے آگے چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اچانک وہ آدمی رکا اور رئیس بھائی سے مخاطب ہو کر بولا:

شاب! آپ لوگ وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں۔

''اس پاپی کی لاش دیکھنے۔'' رئیس بھائی نے جواب دیا۔

''شاب... ایک بات آپ لوگوں کو بتائے دیتا ہوں اس ناگ کو چھیڑنے کی کوشش مت کرنا اور نہ ہی لاش کے نزدیک جانا۔ ایک مرتبہ بستی کے ایک شریر لڑکے نے ناگ کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ ناگ تو نہ مر سکا البتہ وہ لڑکا ضرور مر گیا۔ اول تو گھر آتے ہی اس پر اندھا پن طاری ہو گیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسے شدید بخار نے آ دبوچا اور رات بھر وہ خوف سے چیختا رہا۔ صبح ہوئی تو گھر والوں نے اس کا جسم نیلا پایا۔ بستی کے سیانوں نے مشورہ دیا کہ اس کی لاش کٹیا پر لے چلو۔ کٹیا کے سامنے لاش رکھ کر منتر پڑھے گئے لیکن اس ناگ نے بالکل توجہ نہ کی۔ وہ دور پھن پھیلائے غضب ناک انداز میں پھنکاریں مارتا کھڑا رہا۔ تھک ہار کر بستی والوں نے اس لڑکے کی لاش وہاں سے اٹھائی اور اس کا کریا کرم کر دیا۔ اس دن کے بعد سے آج تک کسی نے ناگ کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کی۔''

''ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے اسے چھیڑنے کی؟'' رئیس بھائی نے اس آدمی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ابھی کچھ دیر پہلے میرے دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا اس پر میں نے

لاحول پڑھی۔ اس آدمی کی تنبیہ مجھے حواسوں میں لے آئی اور میں ناگ کو گولی سے اڑانے کے خیال سے باز رہا۔

اس آدمی نے ہمیں کٹیا کے نزدیک پہنچنے کے بعد ایک جگہ روک دیا۔ یہاں سے اس شیطان کی لاش صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ کٹیا کے دروازے کے آگے چند قدم کے فاصلوں پر درختوں کے نیچے پڑا تھا۔ اس کی لاش واقعی تازہ تھی۔ جوں کی توں' جیسے ابھی ابھی اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے جسم پر جو گیروے رنگ کی دھوتی تھی وہ البتہ اپنا رنگ کھو بیٹھی تھی۔ جگہ جگہ سے بوسیدہ ہو کر پھٹ گئی تھی۔

میں نے بڑے غور سے لاش کے چاروں طرف دیکھا لیکن مجھے کہیں وہ کالا ناگ نظر نہ آیا جس کے میں اتنے چرچے سن چکا تھا۔

میں نے چند قدم آگے بڑھ کر بابا کے چیلے کی لاش دیکھنی چاہی تب وہ آدمی کود کر سامنے آ گیا اور تحکمانہ انداز میں بولا: ''شاب آگے نہ جاؤ۔''

میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور جب لاش پر نظر کی تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لاش کے سرہانے وہ کالا ناگ پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ اس کی دہری لمبی اور سرخ جیب بار بار باہر نکل رہی تھی اور اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ چند لمحے بھی اس کی طرف دیکھنا آسان نہ تھا۔ ویسے ہم لوگ پوری طرح چوکس تھے۔ اس ناگ کی طرف سے حملہ ہونے کی صورت میں ہمارا اسلحہ گولیاں اگلنے کیلئے تیار تھا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ حملہ ادھر سے ہوا نہ ادھر سے۔ ہم وہاں سے بخیر و عافیت واپس آ گئے۔

''وہ لڑکی جس کی وجہ سے اس بابا کے چیلے پر عذاب آیا' آج کل کہاں ہے؟'' میں نے راستے میں اس آدمی سے سوال کیا۔

''شاب وہ لڑکی لاپتہ ہو گئی۔''

''لاپتہ ہو گئی؟'' ہم سب کے چہروں پر سوال ابھرا۔ ''مگر کیسے؟''

''شاب وہ اس واقعہ کے چند روز بعد ہی غائب ہو گئی۔ جنگل میں اپنے کام پر گئی تھی۔ اس دن اس کا بھائی اس کے ساتھ نہ تھا۔ بس جنگل میں ہی کہیں رہ گئی۔ معلوم نہیں کہ کسی کھائی میں گر کر مری یا کسی درندے کے ہتھے چڑھ گئی۔ ویسے اس کا بھائی بستی میں موجود ہے آپ لوگ چاہیں تو اس سے مل لیں۔''

اس کے بھائی سے ملنا وقت ضائع کرنا تھا اس لیے کہ اس ڈرامے میں اس کا کردار خاموش کردار تھا۔ سب کچھ اس کے سامنے ہونے کے باوجود اس کے سامنے کچھ نہ ہوا۔ اس سارے عرصے میں اس پر غشی طاری رہی۔ وہ ہمیں بتاتا تو کیا؟

کٹیا سے واپس آ کر ہم نے کچھ وقت بستی میں گزارا۔ مجھے سورج بابا کی آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا لیکن وہ آ کر نہیں دے رہے تھے۔ ہم اس بستی میں زیادہ دیر نہیں رک سکتے تھے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے اپنے پڑاؤ تک پہنچنا تھا۔ دوسرے اس بات کا بھی خیال تھا کہ چچا جان ہم لوگوں کی طرف سے فکرمند ہو رہے ہوں گے کیونکہ ہمارا پروگرام سہ پہر تک واپس پہنچ جانے کا تھا۔ اب سورج مغرب کی گود میں تھا اور اس کی تیزی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ کرم الٰہی اور فضل الٰہی بھی اندھیرے سے پہلے اپنے علاقے میں پہنچنا چاہتے تھے۔ اندھیرے کا سفر اس گھنے جنگل میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ لہٰذا دل پر جبر کر کے ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں اپنے اپنے جنگل کی طرف چل دیئے اور سورج کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے پہلے اپنے پڑاؤ میں داخل ہو گئے۔

چچا جان کے بارے میں ہمارا اندازہ صحیح نکلا وہ بے قراری کے عالم میں جھونپڑی کے باہر ٹہل رہے تھے اور منشی انہیں تسلیاں دینے کی ناکام کوشش کر رہا

تھا۔ ہمیں دیکھ کر منشی نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ جب ہم لوگ قریب پہنچے تو چچا جان نے ڈانٹ پلانے والے انداز میں کہا۔

''بھئی تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟''

''اس قصے کو میں نے بھی مزدوروں سے سنا تھا لیکن اسے قصے سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ میں نے اسے جھوٹ کا پلندہ ہی جانا تھا لیکن اب تم لوگ خود اپنی آنکھ سے اس خبیث کی لاش دیکھ کر آرہے ہو تو یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ مزدوروں کی بستی میں آج تک نہیں گئے۔''

''میں نے پوچھا؟''

''نہیں آج تک نہیں' اس لیے کہ مزدوروں سے براہ راست میرا کوئی رابطہ نہیں یہ کام اپنا منشی کرتا ہے۔''

''چچا جان آج ایک اور واقعہ بھی پیش آیا۔''

''وہ کیا؟''

''راستے میں اتفاقاً ہماری اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس عفریت سے؟''

چچا جان نے رئیس بھائی کو دیکھا۔

''جی ابا جان۔'' یہ کہہ کر رئیس بھائی نے اس ریچھ انسان سے متعلق روداد چچا جان کے گوش گزار کر دی۔

ہماری باتیں سن کر چچا جان فکر میں ڈوب گئے اور پھر بڑے گہرے لہجے میں بولے۔

''اس عفریت سے نجات حاصل کرنی ہو گی ورنہ سارا بزنس چوپٹ ہو جائے گا۔''

''چچا جان آپ فکر نہ کریں ہم لوگوں نے اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا پروگرام مرتب کر لیا ہے۔ کل ہی اس پروگرام پر عمل شروع ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر ہم نے اپنا سارا پروگرام چچا جان کے سامنے رکھ دیا۔ چچا جان نے ساری باتیں سن کر اپنے مشوروں سے نوازا اور ہم نے ان کے مشوروں کو گرہ سے باندھ لیا۔

دوسری صبح کا سورج ہمارے لئے چیلنج بن کر ابھرا۔ یہ چیلنج اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے سے کم نہ تھا۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی پیشہ ور شکاری نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رئیس بھائی کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ ادھر کرم الٰہی اور فضل الٰہی کو بھی اپنے نشانے پر ناز تھا۔ اگرچہ بندوق میں نے بہت کم چلائی تھی اس کے باوجود میرا نشانہ اتنا برا نہ تھا لیکن اس عفریت کو ٹھکانے لگانے کیلئے اچھے نشانوں سے زیادہ ''اچھی ہمت'' کی ضرورت تھی۔ ہم دونوں اپنی ''ہمتیں'' آزما چکے تھے۔ کرم الٰہی اور فضل الٰہی بھی جیدار دکھائی دیتے تھے۔ اللہ پر بھروسہ کر کے ہم چاروں نے اس عفریت سے نمٹنے کا پروگرام بنا لیا تھا اور اس مشن کو خفیہ رکھنے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے طے کیا کہ کسی مزدور کو اپنے ساتھ نہ رکھیں گے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق کرم الٰہی اور فضل الٰہی اپنی رائفلوں سمیت ہمارے پڑاؤ میں پہنچ گئے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر ہمارے منشی کا ماتھا ٹھنکا تھا اور وہ اب ہمارے اردگرد منڈلا رہا تھا تاکہ ہماری باتوں سے کچھ اندازہ لگا سکے۔

کچھ دیر کیلئے منشی چائے وائے کا انتظام کرنے باہر گیا تو میں نے رئیس بھائی سے کہا۔

''اس منشی کو اپنے ساتھ کیوں نہ لے لیں۔''

''کیوں؟''

رئیس بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ بہت بے قرار نظر آ رہا ہے۔ ساتھ لے لیتے ہیں ذرا تفریح رہے گی۔ کچھ نہیں تو کھانے پینے کا سامان ہی اٹھائے گا۔ ویسے بھی وہ اس عفریت کے راز سے واقف ہے۔''

''ٹھیک ہے لے لیتے ہیں۔''

''لیکن اسے یہ نہیں بتانا ہے کہ ہم ریچھ انسان کو ٹھکانے لگانے جا رہے ہیں اس سے صرف عام شکار کا ذکر کیجئے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' رئیس بھائی نے میری بات سمجھتے ہوئے گردن ہلائی۔

کرم الٰہی اور فضل الٰہی کیونکہ اس گفتگو کے پس منظر سے واقف نہ تھے اس لیے ان کے چہروں پر سوال آ جا رہے تھے۔

جب میں نے عفریت سے پہلی ملاقات کا حال انہیں سنایا اور یہ بتایا کہ منشی کس طرح سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا تھا تو دونوں کے چہرے کھل گئے۔ کرم الٰہی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''پھر تو مزہ رہے گا۔''

کوئی آدھے گھنٹے بعد ہم لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں اس مقام کی طرف روانہ ہوئے جہاں کل عفریت سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں اس کا مل جانا یقینی تو نہ تھا لیکن طے یہی ہوا تھا کہ ہم اپنی مہم کا آغاز اسی جگہ سے کریں گے۔ اس فیصلے کے پیچھے کوئی واضح منطق نہ تھی لیکن اس مہم کا آغاز کہیں سے تو کرنا تھا' لہٰذا یہی طے ہوا کہ اس کی تلاش اسی مقام سے کی جائے۔ شاید آس پاس کے علاقے میں اس سے کہیں ملاقات ہو جائے۔

منشی ہماری گاڑی میں موجود تھا اور بہت خوش تھا۔ خوش کیوں نہ ہوتا اسے ہم نے ساتھ جو لے لیا تھا۔ اس عفریت کو کیا معلوم تھا کہ آئندہ کیسے کیسے سخت مقامات آنے والے ہیں۔

اس مقام پر پہنچ کر ہم نے اپنی گاڑیاں ایک طرف کھڑی کیں اور جنگل میں داخل ہوئے۔ رئیس بھائی سب سے آگے تھے۔ ان کے پیچھے منشی پھر میں اور میرے پیچھے وہ دونوں بھائی۔ جگہ کشادہ ہوتی تو ہم سب ساتھ ہی چلنے لگتے۔

ہم لوگ بہت احتیاط سے چاروں طرف نظر دوڑاتے آگے بڑھ رہے تھے کہ یکایک ہمارے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

☆...☆...☆

پاؤں گڑنے کی وجہ دراصل وہ چیخ تھی جو نزدیک ہی سے سنائی دی تھی۔
ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ یہ چیخ کس کی ہے کہ سامنے سے منشی بھاگتا ہوا نظر آیا۔ خوف کے مارے اس کا برا عالم تھا۔ اس کے منہ سے بڑی خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں اور حالت اس کی ایسی تھی کہ ہنسی روکنی مشکل ہوگئی۔ وہ ہاتھ میں پاجامے کا کمر بند تھامے‘ اسے کندھے سے اتارتا‘ چیختا چلاتا‘ دہائی دیتا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔

ہم چاروں کو دیکھ کر اس لنگور نے منشی کے کندھے سے چھلانگ لگائی اور دوڑتا ہوا درختوں میں گم ہوگیا۔ رئیس بھائی نے فوراً اس کا پیچھا کیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ یہ تو وہی جگہ ہے جہاں ہم نے کل لنگور مارا تھا۔ یہ خیال آتے ہی ہم سب بھی رئیس بھائی کی تقلید میں چل دیئے۔

ہم نے جلد ہی رئیس بھائی کو جالیا۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر کھڑے درختوں کی اوٹ سے سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہماری آہٹ سن کر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور خاموشی سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب بہت آہستگی سے چلتے ان کے نزدیک پہنچ گئے جب میں پتھر پر ان کے برابر کھڑا ہوا تو سامنے بڑا عجیب منظر دیکھا۔ بہت سے لنگور ایک دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے اور درمیان میں اس لنگور کی لاش پڑی تھی جسے رئیس بھائی کی رائفل نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لاش کے ساتھ ایک اکیلا لنگور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شاید وہ

مرنے والے لنگور کی مادہ تھی۔ یہ سارے لنگور اتنے نظم و ضبط سے براجمان تھے کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ غالباً وہ مرنے والے لنگور کی لاش پر ماتم کناں تھے۔

ہم لوگ کچھ دیر بڑی دلچسپی سے اس تعزیتی جلسے کو دیکھتے رہے۔ جب ان کی نشست میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوئی تو ہم لوگ خاموشی سے وہاں سے ہٹ آئے اور اپنی راہ لگ لیے۔
منشی تم چپ چاپ کہاں کھسک لیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہاں رہ گیا تھا۔ بس ذرا اسے چھیڑنے کیلئے بولا: ''بھئی جہاں جایا کرو ذرا بتا کر جایا کرو۔''

''وہ بڑی خیر ہوگئی آج ورنہ یہ لنگور منشی کو پکڑ کر لے جاتے اور اس سے روٹیاں پکوا کر کھاتے۔'' فضل الٰہی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اتنی سنجیدگی سے کہ رئیس بھائی کو بھی ہنسی آ گئی۔

''صاحب جی‘ وہ اچانک ہی میرے اوپر کود پڑا تھا۔ بس اسی لیے میں ڈر گیا ورنہ مجھے معلوم ہوتا کہ لنگور میرے کندھے پر آ بیٹھا ہے تو میں بھلا ڈرتا اس سے۔'' منشی نے ذرا گردن اکڑا کر کہا۔

''ہاں‘ دیکھو بھلا تمہیں اگر معلوم ہوتا کہ لنگور تمہارے کندھے پر آ بیٹھا ہے تو تم فوراً اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتے لو بیٹا آج کا تازہ اخبار پڑھو۔ اس مرتبہ کرم الٰہی نے منشی کی خبر لی۔ ہم لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا۔ بے چارہ منشی شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔

دوپہر تک ہم لوگوں نے جنگل کا خاصا حصہ چھان مارا لیکن اس عفریت سے کہیں ملاقات نہ ہوئی۔ اب بھوک لگنے لگی تھی۔ لہٰذا ایک مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ منشی نے ایک چادر بچھا کر کھانا لگا دیا۔ منشی تھا بہت سلیقے کا۔ اس

نے اس جنگل میں بھی کچھ اس طرح کھانا پیش کیا کہ ہمیں لگا جیسے ہم جنگل میں نہ ہوں گھر میں ہوں۔

کھانا کھا کر کچھ دیر ہم لوگوں نے آرام کیا اور پھر راہ متعین کر کے نکل پڑے۔ اس عفریت کی تلاش میں۔ ویسے آج کا دن ہمیں ضائع ہوتا دکھائی دے رہا تھا ہم کیونکہ خاص طور پر اس ریچھ انسان کی تلاش میں نکلے تھے اس لیے اس کا دکھائی دے جانا محال ہی تھا۔ یوں تو بغیر ڈھونڈے وہ ہمیں دو بار مل چکا تھا۔

ایک دو بار کچھ ایسے جانور دکھائی دیئے جنہیں شکار کیا جا سکتا تھا لیکن ہم لوگوں نے شکار کو سامنے سے گزر جانے دیا۔ یہ سوچ کر کہیں گولی کی آواز سے چونک کر وہ عفریت اس علاقے سے فرار نہ ہو جائے۔

اس ساری احتیاط کا شام تک یہ نتیجہ نکلا کہ نہ خدا ہی ملا اور نہ وصال صنم۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ جنگل میں ویسے بھی شام جلد ہی ہو جاتی ہے۔ ہم لوگوں نے اب اپنی گاڑیوں کی طرف رخ کیا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ہمیں اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جانا تھا۔

دوسرے دن کا پروگرام طے کر کے کرم الٰہی اور فضل الٰہی اپنے علاقے کی طرف چلے گئے اور ہم نے اپنے جنگل کا رخ کیا۔ آگے جا کر ایک دوراہا آتا تھا۔ ایک سڑک مزدوروں کی بستی کی طرف جاتی تھی اور دوسری ہمارے پڑاؤ کی طرف۔ جب ہم اس دوراہے پر پہنچے تو وہاں چار پانچ مزدور کھڑے نظر آئے۔

''یہ تمہاری امت یہاں کیوں کھڑی ہے؟'' رئیس بھائی نے منشی سے مخاطب ہو کر کہا۔

منشی انہیں دیکھ کر پہلے ہی تذبذب کے عالم میں پڑ گیا تھا وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں صاحب۔ آپ ذرا گاڑی روکیں میں دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے۔''

رئیس بھائی نے گاڑی ان مزدوروں کے پاس جا کر کھڑی کی۔ منشی کو دیکھ کر ان لوگوں کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ یہ مزدور اپنے ہی تھے۔

منشی گاڑی سے اتر کر ان کے پاس چلا گیا۔ مزدوروں نے اسے گھیرے میں لے لیا اور لگے چہ میگوئیاں کرنے' وہ اپنی زبان میں منشی کو کچھ بتا رہے تھے اور منشی کے چہرے پر ان کی باتیں سن سن کر ہوائیاں اڑتی جا رہی تھیں۔

''رئیس بھائی! منشی کا چہرہ دیکھ رہے تھے آپ۔''

''ہاں کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے۔'' رئیس بھائی نے اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں وہ عفریت ان مزدوروں کو تو نظر نہیں آ گیا۔''

''شاید۔''

''اگر ایسا ہو گیا تو بہت برا ہو گا۔'' رئیس بھائی فکر مند ہوتے ہوئے بولے۔

''ارے آپ پریشان کیوں ہوں گئے۔ منشی کو بات کر کے تو آنے دیں ممکن ہے کوئی اور بات ہو۔'' میں نے رئیس بھائی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

گفتگو ابھی تک جاری تھی۔ منشی بار بار ہماری طرف پلٹ کر دیکھتا تھا۔ اس دیکھنے نے ہمیں اور شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ بالآخر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں جیپ سے کود کر منشی کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا۔ ''منشی کیا معاملہ ہے؟''

''معاملہ بڑا خطرناک ہے صاحب۔ آپ گاڑی میں چل کر بیٹھیے میں ابھی ساری صورتحال سے آگاہ کرتا ہوں۔'' منشی نے بڑی صفائی سے مجھے وہاں سے ٹال دیا۔

''کیا چکر ہے۔ رئیس بھائی نے مجھے گاڑی کے نزدیک آتے دیکھ کر پوچھا۔

''منشی کہہ رہا ہے کہ میں آ کر بتاتا ہوں۔''

''گھامڑ کا بچہ بلاوجہ سسپنس پیدا کر رہا ہے۔ بتایا کیوں نہیں اس نے۔ ٹھہرو میں بتاتا ہوں' اسے جا کر۔'' رئیس بھائی خانصاحبی پر اتر آئے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا ورنہ اب تک منشی کی خیریت پوچھی جا چکی ہوتی۔

تھوڑی دیر بعد منشی بھاگتا ہوا آیا اور جیپ میں اچھل کر بیٹھتا ہوا بولا۔

''صاحب جی غضب ہو گیا۔''

رئیس بھائی نے کوئی جواب نہ دیا' میں نے ان کے ہونٹ سختی سے بھینچے دیکھے۔ شاید وہ غصہ پینے کی کوشش کر رہے تھے۔

''منشی کیا ہوا؟ کیا وہ ریچھ انسان نظر آ گیا ہے ان لوگوں کو۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں صاحب۔ اس سے بھیانک بات ہوئی ہے۔'' منشی گہرا سانس لے کر بولا۔

''وہ کیا؟''

''کل آپ اوگ مزدوروں کی بستی کی طرف گئے تھے نا۔''

''ہاں' گئے تو تھے۔'' میں نے کہا۔

''بس آپ اوگوں کے وہاں سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سورج بابا بستی میں نمودار ہو گئے تھے۔ وہ حسب معمول اگنی پوجا تک وہاں رہے۔ اس اثنا میں وہ کالا ناگ بھی ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ سورج بابا نے پچھلی بار کی طرح اسے ایک بڑے پیالے میں اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا۔ پھر وہ ناگ کچھ دیر ان کے سامنے پھن پھیلائے کھڑا رہا۔ جیسے نظروں میں کوئی بات ہو رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد سورج بابا نے اس کے اوپر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ پھر وہ بڑی خاموشی سے چبوترے سے اتر کر تاریکی میں گم ہو گیا۔ چاند کے پوری آب و تاب کے ساتھ

نکل آنے تک وہ بستی میں رہے اور اگنی پوجا ختم ہوتے ہی وہ بستی چھوڑ گئے۔ اس دوراہے تک بستی کے لوگ ان کے ساتھ آئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے انہیں لوٹ جانے کو کہا اور خود وہ سامنے والے جنگل میں داخل ہو کر گم ہو گئے۔ منشی سانس لینے کیلئے رکا۔

''وہ بھیانک بات ابھی تک نہیں آئی۔'' رئیس بھائی سے آخر ضبط نہ ہو سکا۔

''صاحب جی۔ وہی بتانے جا رہا ہوں۔ آپ گاڑی چلائیں۔'' منشی نے بڑی نرمی سے کہا۔

''اچھا۔'' یہ کہہ کر رئیس بھائی نے گاڑی سٹارٹ کی۔ اس ''اچھا۔'' میں بڑے معنی پنہاں تھے۔

''تو صاحب جی پھر ہوا یہ کہ آج صبح جب وہ تین مزدور بابا کے چیلے کی کٹیا پر پہنچے تو انہوں نے وہاں معاملہ ہی الٹا پایا۔ اس شیطان کی لاش وہاں موجود نہ تھی اور وہ ناگ جسے سورج بابا نے رات کو اپنے ہاتھوں دودھ پلایا تھا کچلا پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی پتھر سے اس کا منہ کچل دیا گیا ہو۔ یہ دیکھ کر وہ مزدور بستی میں آئے' لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس خبر نے لوگوں کو خوف میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے آس پاس کا تمام علاقہ چھان مارا لیکن اس چیلے کی لاش کا کہیں سراغ نہ ملا۔ پتہ نہیں وہ لاش کہاں غائب ہو گئی۔'' منشی نے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے بات ختم کی۔

''یہ تو واقعی بڑی عجیب بات ہوئی۔ چھبیس سال سے وہ لاش غیر محفوظ ہونے کے باوجود محفوظ پڑی تھی۔ اب ایک ہی رات میں یہ انقلاب آ گیا اور وہ بھی سورج بابا کے جانے کے فوراً بعد۔'' میں رئیس بھائی سے مخاطب تھا۔ یہ حرکت کسی انسان کی تو نہیں ہو سکتی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' رئیس بھائی نے سوچتے ہوئے کہا۔ پھر منشی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''یہ مزدور یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''اصل میں سورج بابا اس جگہ سے جنگل میں داخل ہوئے تھے۔ یہ لوگ اسی امید پر یہاں موجود تھے کہ شاید سورج بابا کہیں دکھائی دے جائیں تو وہ لاش غائب ہونے کی خبر ان تک پہنچا دیں۔'' منشی نے بتایا۔

''وہ تو اب بارہ برس کے بعد ہی لوٹیں گے۔'' میں نے منشی کی طرف دیکھا۔

''ہاں صاحب جی ریت تو یہی ہے۔'' منشی نے جواب دیا۔

ہم پڑاؤ تک اس مسئلے پر غور کرتے آئے کہ یہ لاش کس نے اڑائی ہو گی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ جب ہم نے عفریت کے نہ ملنے اور چیلے کی لاش غائب ہونے کی خبر چچا جان کو سنائی تو وہ حیران و پریشان ہو گئے۔

دوسرے دن پروگرام کے مطابق ہم تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ کرم الٰہی اور فضل الٰہی نے صبح ہی ہمارے پاس پہنچ جانا تھا لیکن وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور ان کے آنے کی امید کم ہوتی جا رہی تھی۔

وقت مقررہ سے جب دو اڑھائی گھنٹے اوپر ہو گئے تو رہی سہی امید بھی خاک میں مل گئی۔

''سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ کہاں رہ گئے۔'' رئیس بھائی فکر مند ہو گئے۔

''کہیں گاڑی واڑی نہ خراب ہو گئی ہو۔''

''نہیں گاڑی تو ان کی ٹھیک ہے۔''

''ان پر خوف تو نہیں سوار ہو گیا۔''

''خوف کیسا..... ؟ ابھی تو انہوں نے عفریت کو دیکھا ہی نہیں۔''

''ہاں' یہ تو ہے پھر آخر کیا ہوا؟ سارا پروگرام چوپٹ کر دیا۔ آیئے ہم دونوں ہی چلتے ہیں۔'' میں نے اپنی بندوق ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے چلو۔'' یہ کہہ کر رئیس بھائی کھڑے ہو گئے۔

اتنے میں منشی بھاگا بھاگا آیا اس نے فارسٹ آفیسر کے آنے کی اطلاع دی۔

چچا جان اس وقت پڑاؤ میں موجود نہ تھے' وہ اوپر کٹائی کی نگرانی کیلئے گئے ہوئے تھے لہٰذا رئیس بھائی کا رکنا ضروری تھا۔ مجبوراً پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔

فارسٹ آفیسر رئیس بھائی ہی سے ملنے آیا تھا' وہ انہیں اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتا تھا۔ رئیس بھائی نے اسے بٹھا کر اسے چائے وائے پلائی پھر مجھ سے یہ کہہ کر کہ میں دو گھنٹے میں واپس آتا ہوں' فارسٹ آفیسر کے ساتھ چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ کر رسالہ پڑھنے لگا۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے نیند آ گئی۔ دماغ پر کیونکہ سورج بابا' ان کا چیلا اور وہ عفریت بسا ہوا تھا اس لیے ان کا خواب میں آ جانا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ میں نے خواب میں سورج بابا کو دیکھا۔ وہ ایک پتھر پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ سرخ سفید چہرہ' سر اور داڑھی کے بال ایک دم سفید ریشم جیسے' جسم پر گیروے رنگ کی دھوتی پہنے' گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی مالا۔ وہ اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو چچا جان سامنے کھڑے تھے۔

''دوپہر ہو گئی بھئی کیا کھانا نہیں کھانا۔''

''جی' ہاں کیوں نہیں۔'' میں فوراً ہی اٹھ گیا اور ہاتھ دھونے کیلئے باہر

نکلا۔

اتنے میں منشی نے کھانا چن دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے اپنے خواب کے بارے میں چچا جان کو بتایا تو وہ خوب ہنسے لیکن میرے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔ ''کیا بات ہے بھئی۔ اس خواب نے تو تم پر گہرے ہی اثرات چھوڑے ہیں۔''

''چچا جان' جانے بار بار مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس خواب کے پیچھے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ کوئی اسرار چھپا ہوا ہے۔''

''ارے' کچھ نہیں ہے بھئی۔ تم آرام سے کھانا کھاؤ کھانا۔''

ان کی نصیحت کے مطابق میں نے آرام سے کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا۔ رئیس بھائی ابھی تک واپس نہ آئے تھے۔ چچا جان کٹائی کی نگرانی کیلئے اوپر جا رہے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں یہ سوچ کر کہ تنہا جھونپڑی میں رہ کر کیا کروں گا ان کے ساتھ ہو لیا۔

آدھے گھنٹے تک ہم جنگل کے نشیب و فراز سے گزرتے رہے۔ جب ہم پڑاؤ پر پہنچے تو وہاں ہر طرف بانسوں کا ڈھیر دیکھا۔ دو چار آدمی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ان بانسوں کے ڈھیروں کے درمیان ایک جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ چچا جان اس جھونپڑی میں بیٹھ کر بانسوں کا حساب کتاب کرنے لگے۔ میری دلچسپی کا یہاں کوئی سامان نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں مزدوروں کو یہاں بانسوں کو کاٹتے ہوئے دیکھوں گا لیکن یہ جگہ تو بطور گودام استعمال ہوتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کٹائی تو کہیں بہت اندر جا کر ہوتی ہے۔

میں نے کچھ دیر ادھر ادھر وقت گزارا۔ جب خاصا بور ہونے لگا تو میں نے چچا جان سے جانے کی اجازت چاہی۔

''ارے کیوں؟ بور ہو گئے کیا؟'' چچا جان نے قلم روکتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے رئیس بھائی اب تک آ گئے ہوں گے۔''

''اچھا۔ ٹھہرو میں کسی آدمی کو تمہارے ساتھ کر دیتا ہوں' وہ تمہیں پڑاؤ تک پہنچا دے گا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کسی کو آواز دی۔

''ارے نہیں چچا جان کسی آدمی کی ضرورت نہیں۔ سیدھا راستہ ہے میں آرام سے پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے یہ بات اس یقین سے کہی کہ چچا جان کو مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔''

میں انہیں خدا حافظ کہہ کر بڑے اطمینان سے اپنے پڑاؤ کی طرف چل دیا۔ ابھی تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ سامنے سے منشی آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے سلام کیا۔

''منشی رئیس بھائی آ گئے کیا؟'' میں نے اس کے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

''ہاں جی۔۔۔ انہیں کھانا کھلا کر ہی وہاں سے چلا ہوں۔ آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے وہ۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔ میں اب وہیں جا رہا ہوں۔''

''صاحب جی۔۔۔ آپ کو راستہ تو یاد ہے؟''

''منشی۔۔۔ راستہ تو سیدھا ہے۔'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

بس یہیں سے میری بدبختی کا دور شروع ہوا' میں جس راستے کو سیدھا اور آسان سمجھ رہا تھا وہ اتنا ٹیڑھا اور مشکل ثابت ہوا کہ ایک قیامت مجھ پر سے گزر گئی۔

وہ راستہ واقعی سیدھا تھا۔ بس ایک جگہ مجھ سے چوک ہو گئی۔ اس دوراہے پر جہاں دو پگڈنڈیاں دو مختلف سمتوں کو جاتی تھیں' میں دائیں جانب والی

پگڈنڈی کے بجائے بائیں جانب والی پگڈنڈی پر چل پڑا اور ہوش اس وقت آیا جب ہوش آنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں جنگل کی بھول بھلیوں میں پھنس چکا تھا۔

میں اپنے اندازے سے جیسے ہی سیدھی راہ پکڑنے کی کوشش کرتا وہ راستہ یا کسی اونچی چٹان پر ختم ہو جاتا یا آگے کوئی کھائی آ جاتی یا پھر گھنا جنگل شروع ہو جاتا۔ نتیجے میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔

راستہ بھولنے کا خوف میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ میں قطعاً نہتا تھا۔ بندوق میں اپنے ساتھ لے کر نہیں چلا تھا اور چاقو جیسی چیز بھی اپنی جیب میں نہ تھی۔ کسی درندے سے سامنا ہونے کی صورت میں سر جھکا کر خود کو پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ ذرا اپنے حواس درست کیے جائیں۔ حواس درست کرنے کیلئے کسی بدترین بات پر غور کرنا ضروری تھا۔ مثلاً میں نے سوچا کہ شاید میں اب کبھی اپنے پڑاؤ تک نہ پہنچ سکوں۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر میں پڑاؤ تک نہ پہنچ تو اس درندوں سے بھرے جنگل میں کتنے دن زندہ رہوں گا۔ فرض کرو کسی درندے کی ''نظر عنایت'' سے میں کسی طرح محفوظ رہا تو اس جنگل میں میں بھوکا پیاسا کتنے دن زندہ رہوں گا۔ لہٰذا میں نے فوراً بڑی فراخدلی سے یہ نتیجہ نکالا کہ میں بہت جلد اللہ کو پیارا ہونے والا ہوں۔ جب میں نے موت کو چادر کی طرح اپنے اوپر اوڑھ لیا تو آپ یقین جانیں کہ میرے دل سے خوف کے بادل فوراً ہی چھٹ گئے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی مدافعت کے لیے ایک لمبا سا بانس توڑا اور اسے لاٹھی کی طرح ہاتھ میں لے کر تھاما۔ فوراً ہی دل میں اعتماد پیدا ہوا کہ چھوٹا موٹا جانور اتنی آسانی سے نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

اب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کا وقت نہ تھا۔ شام ہونے والی تھی اور دن کی روشنی میں راستہ تلاش کرنے کی جتنی کوشش ہو سکتی تھی کر لینی چاہیے تھی۔ سوال

یہ تھا کہ جاؤں تو جاؤں کدھر۔

فوراً ہی ایک ترکیب دماغ میں آئی کہ اللہ کا نام لے کر سکہ اچھالا جائے اور دو منتخب راستوں میں سے سکے کے مطابق چلا جائے۔ سکہ اچھال کر میں نے ایک سمت پکڑ لی اور تیز تیز چلنے لگا۔ آگے جیسے ہی راستے میں پیچیدگی پیدا ہوتی میں فوراً سکے کا سہارا لیتا پھر چل پڑتا۔

میں تقدیر کے سکے کے سہارے آگے تو بڑھ رہا تھا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ بس خدا کے بھروسے پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور وہ وقت زیادہ دور نہ تھا جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا بند ہو جاتا۔ اس سے پہلے کہ جنگل میں مکمل تاریکی پھیلتی میں آگے بڑھنے کا پروگرام ملتوی کر کے ایک اونچے اور مضبوط درخت کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔ اس جنگل میں ایسے درختوں کی کمی نہ تھی۔ بالآخر ایک درخت پر میری نظریں جم گئیں۔ یہ درخت اونچا تھا' مضبوط تھا اور ذرا الگ تھلگ تھا۔ میں نے اس درخت پر رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ بس یہی ایک ذریعہ تھا جس سے خود کو محفوظ کیا جا سکتا تھا اور وہ بھی کسی حد تک کیونکہ ریچھ یا وہ عفریت اس درخت پر بھی چڑھ کر میری خیریت پوچھ سکتا تھا۔

مجھے درخت پر چڑھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ بچپن کی پریکٹس کام آ گئی۔ میں نے درخت پر ایک محفوظ جگہ تلاش کی اور اللہ سے لو لگا کر بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ جنگل کی یہ پرفسوں رات کسی طرح خیریت سے گزر جائے۔

مصیبت کے وقت ہمیں خدا کثرت سے یاد آتا ہے' اس کا اندازہ ہر شخص کو ہوگا' اگر یہی شدت خوش بختی کے زمانے میں بھی برقرار رہے تو شاید ہم پر کوئی مصیبت ہی نازل نہ ہو' میں نے سوچا۔

میں دھڑا دھڑ اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ خدا کے حضور گڑگڑا رہا تھا کہ اللہ مجھ بھٹکے ہوئے کو سیدھا راستہ دکھا' جنگل کے اس جال سے نکال' میری جان کی حفاظت کر۔ دعا مانگتے مانگتے میرا دھیان پڑاؤ کی طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ اب تک ان لوگوں کو میرے گم ہونے کا پتہ چل گیا ہو گا۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی تدبیر کر رہے ہوں گے۔ پھر سوچنے لگا وہ لوگ مجھ تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ مجھے اس رات کے شر سے بچانے کی ان کے پاس کیا تدبیر ہو سکتی تھی بھلا۔ اگر کوئی تدبیر تھی تو میرا ذہن اسے سوچنے سے قاصر تھا۔

بعد میں رئیس بھائی کی زبانی معلوم ہوا کہ جب چچا جان مغرب کے وقت پڑاؤ میں پہنچے تو رئیس بھائی نے انہیں تنہا دیکھ کر میرے بارے میں پوچھا۔ چچا جان کے جواب میں رئیس بھائی کو لرزا دیا کیونکہ ان کے بیان کے مطابق مجھے کب کا پڑاؤ میں ہونا چاہیے تھا۔ دونوں باپ بیٹوں کو فوراً ہی صورتحال کی سنگینی کا علم ہو گیا۔ رئیس بھائی ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر گاڑی کی طرف بھاگے اور اس وقت جب میں ان کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ فاریسٹ آفیسر کے بنگلے کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ وہاں انہوں نے صورتحال بتا کر جنگل کے محافظ اور سرچ لائٹ وغیرہ حاصل کیں۔ پڑاؤ واپس آئے۔ وہاں سے انہوں نے چند مزدوروں کو پکڑا اور دس بارہ آدمیوں کا یہ قافلہ مجھے تلاش کرنے کیلئے نکل کھڑا ہوا۔

وہ ساری رات ڈھول پیٹتے' مجھے آوازیں دیتے درختوں پر سرچ لائٹ ڈالتے' جانے جنگل میں کہاں کہاں مارے پھرتے رہے اور میں جانے جنگل کے کس حصے میں اپنی جان چھپائے سحر ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ قیامت کی رات تھی۔ تنہا آدمی' درندوں سے بھرا جنگل' خوناک

تاریکی' عجیب عجیب لرزا دینے والی آوازیں' لمحہ لمحہ خوف' لمحہ لمحہ حیرت اور وسوسے طرح طرح کے خیالی ہیولے' اس رات معلوم ہوا کہ جنگل کی سائیں سائیں کیا ہوتی ہے۔ وہ پوری رات جیسے سولی پر گزری سولی پر بھی شاید اتنا خوف' دہشت اور بے چینی نہ ہوتی جتنی اس رات ہوئی۔

ہر آہٹ پر کان کھڑے ہوتے' ہر آواز پر دل دھڑکتا اور حلق میں آتا ہوا محسوس ہوتا۔ میں بانس کو مضبوطی سے پکڑ لیتا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھورتا۔ کچھ نظر نہ آتا۔ یہی عذاب جھیلتے بالآخر امید کا سورج چمکا۔

جنگل میں جہاں شام جلدی ہوئی وہاں سحر دیر سے ہوتی ہے۔ میری گھڑی سورج طلوع ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ لیکن جنگل میں اس طرح اندھیرا پھیلا ہوا تھا جیسے رات کے تین بجے ہوں۔ خیر یہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ رات بخیر گزر گئی۔ اندھیرے کا کیا تھا اس نے تو چھٹنا ہی تھا' جنگل کب تک اجالے کی کرنوں سے مقابلہ کر سکتا تھا۔

روشنی پھیلنے کے ساتھ ہی میں نے درخت سے پھسلنا شروع کیا اور نیچے آ کر سوچنے لگا کہ اب کدھر جاؤں؟

تب ہی کھوں کھوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز میری پشت سے آئی تھی۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا اور بانس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

وہ ایک لنگور تھا جو درخت کی شاخ سے جھول رہا تھا اور اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے ڈرانے کیلئے بانس کو ذرا حرکت دی تو وہ دانت نکوس کر پھر سے مجھ پر کھوکھیایا اور درخت سے کود کر زمین پر آ گیا۔

پھر وہ تیزی سے میری طرف آیا۔ میں نے فوراً بانس سیدھا کیا وہ میرے نزدیک آ کر رکا۔ ''کھوں کھوں'' کی پھر اسی تیزی سے واپس ہو گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورنے

لگا۔

چند لمحوں بعد پھر وہ تیزی سے میری طرف آیا۔ اس مرتبہ میں خاموشی سے کھڑا رہا۔ وہ میرے نزدیک آ کر رکا ''کھوں کھوں'' کی پھر تیزی سے واپس اسی جگہ بیٹھ گیا۔

میں اس کی اس حرکت سے الجھن میں پڑ گیا۔

تھوڑی دیر مجھے گھورنے کے بعد اس نے پھر وہی حرکت کی۔ تیزی سے میری طرف آنا' کھوکھیانہ اور پھر واپس چلے جانا۔

اس مرتبہ میں کچھ سوچ کر اس کی طرف بڑھا مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ زور زور سے اچھلا جیسے مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر خوش ہوا ہو اور آگے کی طرف بھاگا۔ میں چند قدم اس کی طرف اٹھا کر رک گیا۔

مجھے رکتا دیکھ کر اس نے پھر وہی حرکت کی۔ میری طرف تیزی سے آیا کھوں کھوں کی اور پھر اسی تیزی سے واپس جا کر کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

میں نے پھر اس کی جانب قدم بڑھائے تو وہ پھر زور زور سے اچھل کر آگے چل دیا۔ اس مرتبہ میں نے چند قدم کے بجائے بیس پچیس قدم اس کی سمت اٹھائے تو وہ چلتا ہی گیا۔

میں چلتے چلتے اچانک رک گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

اس نے جب چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مجھے کھڑا پایا تو خود بھی رک گیا اور اسی انداز سے میری طرف تیزی سے آیا دانت نکوس کر آوازیں نکالیں اور پھر تیزی سے واپس چل دیا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی کہ وہ لنگور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں اسے خدا کی مدد سمجھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔

مجھے مستقل اپنے تعاقب میں آتا دیکھ کر وہ زور زور سے اچھلتا اور پھر

کبھی زمین پر اور کبھی درختوں کی شاخوں سے جھومتا تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔

اس لنگور کی رہنمائی میں چلتے ہوئے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا وہ مجھے بڑے خطرناک راستوں سے گزار کر اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

ایک جگہ چلتے ہوئے ایک ایسا راستہ آ گیا کہ مجھے ٹھہرنا پڑا۔ وہ لنگور تو بڑے مزے سے اس عمودی چٹان پر چڑھتا چلا گیا لیکن میرے لیے اس چٹان پر چڑھنا آسان نہ تھا۔

جب اس نے مجھے نیچے کھڑا دیکھا تو دانت نکوس کر آوازیں نکالیں۔ غالباً وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کی ترغیب دے رہا تھا لیکن شاید وہ یہ بھول گیا تھا کہ میں چوپایہ نہیں دو ٹانگ کا جانور ہوں وہ بھی بولنے والا۔

کچھ دیر وہ چٹان پر بیٹھا قلابازیاں کھاتا رہا پھر اچانک پھسل کر نیچے آیا اور میرے قریب سے گزرتا ایک طرف چل دیا۔

میں پھر اس کے تعاقب میں چل دیا اور یہ اندازہ کرتے مجھے ذرا دیر نہ لگی کہ اب وہ جس راستے سے جا رہا تھا وہ گھوم کر ضرور اس چٹان کے عقب میں نکلتا ہو گا اور ہوا بھی ایسا ہی۔

وہ راستہ خاصا گھوم کر چٹان کے پیچھے نکلا۔ وہ لنگور اچھلتا کودتا تیزی سے آگے چلا جا رہا تھا اتنی تیز کہ میں پیچھے رہ جاتا۔ مجھے پیچھے دیکھ کر وہ رک جاتا اور اپنے کان کھجانے لگتا۔

اب میں اس کے پیچھے چلتے چلتے تھکنے لگا تھا۔ منزل تھی کہ آ کے نہیں دے رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے کدھر لیے جا رہا تھا؟ اچانک خیال گزرا کہ یہ لنگور کہیں مجھے مصیبت میں نہ پھنسا دے ممکن ہے یہ مجھے لنگوروں کے گڑھ میں لیے جا رہا ہو۔ شائد لنگور مجھ سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلا لینا چاہتے ہیں۔ فوراً ہی ذہن نے اس خیال کی تردید کی۔ جانوروں میں اتنی عقل

کہاں کہ وہ ایسی منصوبہ بندی سے کام لیں اور پھر یہ سب اتفاقاً ہو گیا تھا۔ میں نہ راستہ بھولتا اور نہ اس لنگور سے ملاقات ہوتی۔ ہاں یہ پڑاؤ سے مجھے کھینچ کر لاتا' پھر تو اس طرح کی بات سوچی جا سکتی تھی۔ میں نے لنگوروں کو لاش کے گرد جس انداز سے بیٹھے دیکھا تھا اس سے ان کی اسراریت اجاگر ہوتی تھی۔

خیر جو کچھ بھی تھا سامنے آنے والا تھا۔ میں تو پہلے ہی کھلے سمندر میں ایک ٹوٹی کشتی پر سوار تھا۔ زندگی کی آس کیلئے میں ہر طرح کا خطرہ لینے کیلئے تیار تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں اس لنگور کے ساتھ نالے پر آ نکلا میرا خیال تھا کہ مجھے اس نالے کو پار کرنا ہو گا۔ میں اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش میں تھا کہ لنگور نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ نالے کے کنارے پتھر ہی پتھر تھے مجھے ان پتھروں پر چلنے میں دشواری ہو رہی تھی لیکن وہ لنگور مزے سے چھلانگیں بھرتا آگے بڑھا جا رہا تھا۔

تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد پتھروں کا ایک اونچا سلسلہ آ گیا۔ یہ سلسلہ ایسا تھا کہ اس پر آسانی سے چڑھا جا سکتا تھا۔ پتھر کچھ اس انداز سے رکھے ہوئے تھے کہ سیڑھیاں سی بن گئی تھیں۔

لنگور کے ساتھ میں نے ان پتھروں پر قدم جما کر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ کچھ دیر چڑھتے چڑھتے جو اوپر نظر اٹھائی تو بقول ڈارون انسان کی اصل کو غائب پایا۔ میں نے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر ''حضرت جی'' کہیں نہ دکھائی دیئے۔ چڑھتے چڑھتے اپنا سانس پہلے ہی چڑھا ہوا تھا لہٰذا ایک پتھر پر آرام کی غرض سے بیٹھ گیا۔

سانس درست ہونے میں دو چار منٹ لگے پھر اٹھا اور گردن اٹھا کر اوپر دیکھا اس لنگور کا دور تک پتہ نہ تھا لیکن مجھے اس بات کا یقین تھا کہ وہ اوپر ہی گیا

ہے۔ لہٰذا میں اللہ کا نام لے کر اوپر چڑھنے لگا۔

اوپر پہنچا تو یہاں کا منظر ہی عجیب پایا۔ مجھے یکایک ایسا احساس ہوا جیسے میں کسی چڑیا گھر میں آ گیا ہوں۔ جہاں تک میری نظر گئی میں نے ہر طرف پرندوں کو ہی پایا' کبوتر' طوطے' مور' چیلیں' شکرے' چڑیں' کوئے' فاختائیں اور نہ جانے کیا کیا۔ اس طرح گھوم پھر رہے تھے جیسے دعوت میں آئے ہوں۔

پھر میری نظر درختوں میں گھری بانسوں کی ایک خوبصورت کٹیا پر پڑی۔ میں ان پرندوں کے درمیان سے گزرتا اس کٹیا کی طرف بڑھا۔

جب میں کٹیا کے نزدیک پہنچا تو مجھے کوئی دروازہ نہ دکھائی دیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ کٹیا کی پشت ہے میں دائیں جانب سے گھوم کر اس کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک میری سٹی گم ہو گئی۔

میں دم بخود اس شے کو دیکھ رہا تھا جو اپنے ہاتھ پاؤں پسارے بڑے آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے گردن اٹھائی اور پھر اس کی دھاڑ سے پورا پہاڑ ہل گیا' میں تیزی سے پلٹ کر بھاگا۔

ابھی میں کٹیا کی پشت پر ہی پہنچا تھا کہ اس میں سے آواز آئی۔

''ڈرو مت یہاں کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا''

میں بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ اس آواز میں ایسا ہی سحر تھا۔

شیر نے اگرچہ دھاڑنا بند کر دیا تھا' اس کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں اس کے سامنے سے گزر کر کٹیا میں پہنچوں اور اس آدمی سے ملاقات کر سکوں جس کی آواز نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔

میں ابھی گومگو کے عالم میں تھا۔ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگوں یا آواز کی پکار پر پھر شیر کے منہ میں چلا جاؤں۔

''ڈرو مت اندر آ جاؤ اسے بلی سمجھو۔'' اندر سے پھر آواز آئی۔

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا تو سامنے سے وہی شیر آتا ہوا نظر آیا۔ ایک لمحے کو میری روح میرے جسم سے پرواز کر گئی پھر وہ انوکھی بات ظہور پذیر ہوئی وہ خوفناک شیر میرے برابر سے بلی کی طرح گزر گیا۔ میں کٹیا کے بانسوں سے چمٹا اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس پہاڑی سے نیچے اتر گیا۔

میری جان میں جان آئی۔

اب میں قدم بڑھاتا ہوا کٹیا کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ اندر سے بند تھا اور دروازے پر ''ہنومان جی'' براجمان تھے۔ مجھے دیکھ کر اس لنگور نے چار پانچ قلابازیاں کھائیں اور زور سے اچھلا غالباً یہ خوشی کا اظہار تھا۔

اچھلتے ہوئے وہ ایک مرتبہ دروازے سے ٹکرایا تو وہ فوراً ہی کھل گیا۔ کھلے دروازے سے مجھے جو کچھ نظر آ رہا تھا' وہ میری آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی تھا۔

☆ ☆ ☆

میرے سامنے زمین پر چار لنگور بیٹھے تھے۔ ان لنگوروں کے درمیان ایک سرخ شال پڑی تھی اور اس شال پر وہ ہاتھ رکھا تھا۔

''کون سا ہاتھ؟''

وہ ہاتھ جو بریلی آتے ہوئے مجھے ٹرین میں ملا تھا۔ جو کسی عورت کا تھا اور کہنی سے کٹا ہوا تھا جس سے تازہ تازہ خون رس رہا تھا۔ گورے رنگ کا یہ ہاتھ کالی چوڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کلائی پر کہیں کہیں زخموں کے نشان تھے جو مزاحمت کے دوران چوڑیاں ٹوٹنے سے آئے ہوں گے۔ ہاتھ کی انگلی میں ایک بھاری سی خوبصورت سونے کی انگوٹھی تھی۔

لنگوروں نے مجھے دیکھ کر اس ہاتھ کو بڑی احتیاط سے اٹھایا اور ''کھوں کھوں'' کرتے کٹیا سے باہر نکل گئے۔ ان کے نکل جانے کے بعد جب میں نے کٹیا میں نظر دوڑائی تو دائیں جانب اندرونی حصے میں میں نے شیر کی کھال پر ایک شخص کو آلتی پالتی مارے بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکان تھی اور آنکھوں میں ہیرے جیسی چمک تھی۔ گھنی اور لمبی داڑھی' سر کے بال شانوں پر پڑے ہوئے۔ سرخ سفید چہرہ' صحت مند جسم' مجموعی طور پر وہ ایک پروقار اور پرکشش آدمی تھا اور اپنے چہرے مہرے سے چالیس سال کا دکھائی دیتا تھا۔

اس وقت میں عجیب کیفیت سے دوچار تھا۔ مجھے پچھلے چند دنوں میں

اتنے انوکھے واقعات پیش آئے تھے اور ایسی پراسرار صورتوں سے دوچار ہوا تھا کہ دماغ سن سا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو گیا ہوں۔ شاید اسی لیے میں اس شخص کو بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا' زبان سے کچھ نہ بولا۔

اس نے ہیرے کی طرح جگمگاتی آنکھوں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

میں بڑی فرمانبرداری سے نیچے بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا اور ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگا۔

''تم بھوکے ہو گے کچھ کھا لو پھر آرام سے بات کریں گے۔'' اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' بھوک تو مجھے بہت لگی ہے لیکن اس جنگل میں کیا ملے گا کھانے کو؟''

''کیا کھانا چاہتے ہو؟''

''یہاں مجھے کھانے کو کیا مل سکتا ہے میں نے مینو طلب کیا۔''

''ہر چیز دودھ' دہی' مکھن' پوری' کچوری' آلو کا ساگ اچار' چٹنی' مربے' سبزی ترکاری' بولو کیا چاہیے؟'' وہ شخص ایک لمحے کو مجھے کسی ہوٹل کا بیرا معلوم ہوا۔

''پوریاں' آلو کا ساگ' اچار اور چٹنی۔'' میں نے فرمائش کی۔ ابھی میں اپنا جملہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ ایک اور ناقابل یقین بات ہوئی۔ پلک جھپکتے ہی میرے سامنے ایک بڑی سی پیتل کی تھال آ گئی۔ جس میں میری مطلوبہ چیزیں بڑے قرینے سے رکھی تھیں۔ پوریوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

بھوک اتنی شدت کی تھی کہ کسی بات پر غور کرنا اب میرے بس میں نہ تھا لہٰذا سارے سوالوں کو جو ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے ایک طرف رکھ کر کھانے میں

جٹ گیا۔

کھانا انتہائی مزیدار تھا اور اتنی وافر مقدار میں تھا کہ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے دوران وہ شخص مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

پیٹ میں کھانا پڑتے ہی میرے ہوش و حواس بحال ہو گئے۔ میں نے سوچا سب سے پہلے اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں کہ یہ کون ہے؟

میں نے سوال کرنے کیلئے ابھی لب کھولے ہی تھے کہ اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بولنے سے منع کر دیا اور خود بولا۔

''میں بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں؟''

پھر وہ چند لمحے خاموش رہا میرا صبر آزمانے کے بعد گویا ہوا۔

''میرا نام سورج ہے۔''

''سورج۔'' میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ''یعنی سورج بابا۔''

''ہاں...... میں سورج بابا ہوں۔''

''تعجب ہے میرا خیال تھا کہ آپ خاصی عمر کے آدمی ہوں گے جس کی بھنویں تک سفید ہوں گی لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا۔ بھنویں سفید ہونا تو دور کی بات ہے آپ کے سر کے بال بھی سفید نہیں' سب کے سب کالے ہیں۔''

''تمہارے خیال میں میری عمر کیا ہو گی؟''

''زیادہ سے زیادہ چالیس سال۔'' میں نے بڑے یقین سے کہا۔

''میں اس وقت صرف اسی سال کا ہوں۔'' سورج بابا نے اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اسی سال کا سن کر میں نے بغور سورج بابا کو دیکھا لیکن وہ کہیں سے بھی مجھے اتنے عمر رسیدہ نظر نہیں آئے۔ میرا جی چاہا کہ میں کہوں' یہ بات ناقابل یقین

ہے۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھے جیسے انہوں نے میرے جی کی بات جان لی ہو۔

''ہاں' اس دنیا میں بہت سی باتیں ناقابل یقین ہوتی ہیں اور یہ باتیں اس لیے ناقابل یقین ہوتی ہیں کہ ہم ان کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ہم میں ان کی اصل جاننے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ ہم جاننے کی خواہش رکھنے کے باوجود اصل نہیں جان سکتے۔ اصل صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس کیلئے تپسیا کرتے ہیں' ریاض کرتے ہیں' کشٹ بھوگتے ہیں' اپنے نفس کو مار کر دائمی زندگی حاصل کرتے ہیں۔ جو لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں ان کے سامنے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں پھر وہ کائنات میں چھپی ہزاروں دنیاؤں کا نظارہ کرتے ہیں۔ کائنات کے راز ان کے سامنے آئینے کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں اور وہ ہر چیز کو اس کے اصل روپ میں دیکھتے ہیں۔ ان کی ساری حیرتیں تمام ہو جاتی ہیں۔ ایک عام آدمی دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے وہ ہزارواں حصہ ہوتا ہے۔ ان خاص لوگوں کے مقابلے میں جو حقیقت کو پا جاتے ہیں۔ میں تمہیں اسی سال کا ہونے کے باوجود چالیس کا دکھائی دیتا ہوں تو اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ میرا جسم فضائی آلودگیوں سے پاک ہے' اسی لیے توانا ہے۔''

میں سورج بابا کی بات کچھ سمجھا' کچھ نہ سمجھا کیونکہ میرا شمار خاص لوگوں میں نہ ہوتا تھا میں تو ایک عام آدمی تھا۔ نفس کا غلام' گناہگار اور سیاہ کار۔

''بابا جی اجازت ہو تو کچھ سوال کروں۔ میں بہرحال ایک عام آدمی ہوں اور پچھلے چند دنوں میں ایسے عجیب وغریب واقعات سے دوچار ہوں کہ مجھ پر پاگل پن کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان پراسرار واقعات سے پردہ اٹھائیں۔ سب سے پہلے تو میں اس ہاتھ کے بارے میں جاننا

چاہوں گا۔ جسے میں نے پہلی بار ٹرین میں دیکھا تھا اور دوسری بار تھوڑی دیر پہلے اسی کٹیا میں۔ وہ ہاتھ کس کا تھا؟''

''اس کے بعد دوسرا سوال کیا ہوگا؟'' بابا جی نے مسکرا کر پوچھا۔

''پھر میں اس عفریت کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھوں گا۔''

''اس کے بعد.....؟''

''اس کے بعد میں آپ کے چیلے کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہوں گا۔''

''اچھا تو پھر سنو دراصل ان تینوں سوالوں کا جواب ایک ہی آدمی سے وابستہ ہے اور وہ ہے بدری ناتھ جسے تم نے ابھی میرا چیلا کہا اور تم ہی کیا ساری دنیا اسے میرا چیلا کہتی ہے۔ یعنی بابا کا چیلا اور واقعی میرا چیلا تھا۔ ایسا چیلا جس پر مجھے فخر تھا۔ کاش مجھے اس پر ہمیشہ فخر رہتا لیکن یہ منش' یہ مانس' یہ انسان بھگوان کی پیچیدہ ترین تخلیق ہے۔ اس پر بھروسہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے اڑتے بادل پر بھروسہ کر لینا۔ تم نے مولانا روم کی مثنوی معنوی تو پڑھی ہوگی۔ ایک جگہ انہوں نے بشر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان خیر وشر کا مجموعہ ہے۔ خیر کا عنصر غالب آ جائے تو انسان فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے اور شر کا پہلو روح پر چھا جائے تو آدمی جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ خیر وشر کی جنگ انسان کے اندر اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کوئی پہلو اس پر غالب نہ آ جائے۔ میرے اپنے خیال میں نیکی اور بدی کے درمیان صرف ایک لمحہ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ شیطانی قوتیں انسان کے اندر اسی کمزوری کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ آدمی اندر سے مضبوط ہو تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا ورنہ عمر بھر کی کمائی ایک لمحہ میں لٹ جاتی ہے۔ بدری ناتھ کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ایک کمزور لمحے نے اسے ڈس لیا اور پھر وہ ہمیشہ کیلئے زہر آلود ہو گیا۔ بدری ناتھ پہلی

بھیت کا رہنے والا تھا۔ اسے وہاں کے ایک گرو نے میرے پاس بھیجا تھا اور اپنے پتر میں اس بات کی سفارش کی تھی کہ میں اسے اپنا شِشّ بنا لوں۔ مزدوروں کی بستی میں پہنچ کر اس نے لوگوں سے میرا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ میرا پتہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ سورج بابا بارہویں سال بستی میں وارد ہوتے ہیں۔ نو سال گزر چکے ہیں اب صرف تین سال باقی رہ گئے ہیں۔ یہ سن کر اس نے بستی سے ذرا الگ ایک کٹیا بنائی اور گیان دھیان میں مصروف ہو گیا۔
تین سال بعد جب میں بستی میں پہنچا تو اسے بڑی بے تابی سے اپنا منتظر پایا۔
جب اس نے میرا چیلا بننے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اس سے کہا:

''بارہ سال کا بن باس بھوگنا ہوگا۔ ابھی تم نوجوان ہو اچھی طرح سوچ لو۔ بارہ سال سے ایک دن پہلے بھی اگر تم نے انسانوں کی بستی میں قدم رکھا تو سب کچھ نشٹ ہو جائے گا۔ تم ادھر کے رہو گے نہ ادھر کے۔''

یہ سن کر اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور بڑے یقین سے بولا:

''سوامی جی! میں ایسے کئی یگ آپ کے ساتھ بتا سکتا ہوں۔

اس کے جواب نے مجھے خوش کیا اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر جنگل میں آ گیا۔ اس وقت میری کٹیا یہاں سے پانچ میل دور تھی۔ میں ہر بارہویں سال اپنا رہائشی علاقہ بدل دیتا ہوں۔ خیر اگلے بارہ برس تک وہ میرے ساتھ رہا۔
ان بارہ برسوں میں ایک دو بار ایسے مقام آئے کہ تپیا کی کٹھنائیوں نے اسے بیزار کر دیا اور نفس کے اژدھے نے سر ابھارا لیکن میری بروقت دیکھ بھال نے نفس کے اژدھے کو مار بھگایا۔ بارہ برس کے بعد جب وہ میرے ساتھ بستی میں آیا تو وہ کندن تھا' ترشا ہوا ہیرا تھا جو اپنی ریاضت اور تپیا سے جگمگا رہا تھا۔ بستی والوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں نے کیونکہ اس کا تعارف اپنا چیلا کہہ کر کروایا تھا لہٰذا اس کا نام بابا کا چیلا پڑ گیا۔ اس کا اصل نام کسی کو یاد نہ رہا۔ میں بدری

ناتھ کو بستی میں اپنا جانشین بنا کر واپس آ گیا۔''

''چھ سال تک میرا چیلا نیکی کی راہ پر چلتا رہا۔ میں نے اسے جو کچھ دیدیا تھا اس سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان چھ سالوں میں اس کی باطنی قوتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں شفا آ گئی' آنکھوں میں مقناطیسی قوت پیدا ہو گئی۔ جس پر نظر ڈالتا تھا وہ اس کا ہو جاتا تھا۔ وہ دکھی انسانیت کی خدمت تن من دھن سے کرنے لگا اور چند سالوں میں ہی وہ بستی کا دیوتا بن گیا۔
لوگ اسے بے حد عزت اور احترام دینے لگے۔ اس کا حکم ماننا ان کیلئے مقدس فریضہ ٹھہرا۔''

''شفا یابی کی قوت عطا کرتے وقت میں نے اسے تنبیہ کی تھی کہ عورتوں کا علاج کرتے وقت ان کے جسموں سے دور رہنا۔ ہاں مردوں کا علاج تم ان کے جسموں پر ہاتھ پھیر کر کر سکتے ہو۔ عورتوں کے علاج کیلئے پانی استعمال کرنا۔
چھ سال تک وہ میری اس ہدایت پر عمل کرتا رہا اور لوگوں کی دعائیں لیتا رہا۔ اس کے پاس سانپ کے کاٹے کا بھی علاج تھا۔ میں نے اسے ایک پتھر عطا کر دیا تھا جو زہر چوس لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس پتھر سے اس نے بہت سی زندگیاں بچائیں۔ بالآخر یہ پتھر ہی اس کی موت کا سبب بن گیا۔

''پھر ایک لمحے میں اس کی اٹھارہ سالہ تپیا بھنگ ہو گئی۔ شاید تمہیں اس بات کا یقین نہ آئے کہ ایک آدمی اٹھارہ سال تک نیکی کی راہ چلتے چلتے اچانک بدی کی راہ کیسے چلنے لگا۔ جیسا کہ میں نے ابھی تمہیں بتا دیا تھا کہ شیطانی قوتیں ہمیشہ پرہیزگار لوگوں کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ وہ ان کیلئے ہر لمحہ ترغیب کا سامان کرتی رہتی ہیں۔ دل میں وسوسے ڈالتی ہیں۔ اگر ان قوتوں کو بال برابر بھی پاؤں جمانے کا موقع مل جائے تو یہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں اور یہ بال برابر جگہ بڑھتے بڑھتے دراڑ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح شخصیت

بکھر بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت مٹی میں ملا دینے والا لمحہ ایک
عورت کی صورت میں اس پر نازل ہوا۔ ایک فاریسٹ آفیسر کی نوبیاہتا بیوی کے
سر میں اس قدر شدید درد اٹھا کہ وہ عورت دیوار سے سر ٹکرانے لگی۔ فاریسٹ
آفیسر نے میرے چیلے کی شہرت سن رکھی تھی۔ وہ فوراً اپنی گاڑی میں بیٹھ کر
مزدوروں کی بستی میں پہنچا اور اس نے میرے چیلے بدری ناتھ کو ساری صورتحال
سے آگاہ کیا۔ بدری ناتھ نے آج تک تمام مریضوں کو کٹیا ہی میں دیکھا تھا۔ اس
نے فاریسٹ آفیسر سے یہی مطالبہ کیا کہ وہ اپنی بیوی کو یہاں لے آئے لیکن
فاریسٹ آفیسر نے کچھ اس طرح منت سماجت کی' کچھ ایسی معذوری ظاہر کی کہ
بدری ناتھ سوچ میں پڑ گیا۔''

''اس اثنا میں وہ فاریسٹ آفیسر مسلسل خوشامد کرتا رہا۔ ایک سرکاری
آفیسر کو اس قدر خوشامد کرتے دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا اور اس کے ساتھ چل
دیا۔''

''ڈاک بنگلے میں اس کی بیوی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس پر جیسے جنون
کی کیفیت طاری تھی۔ وہ نیلی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ گورے بدن کی عورت نے
سر سے پٹی باندھ رکھی تھی اور اس کی خوبصورت آنکھیں انگارے کی طرح دہک
رہی تھیں۔ سر میں شدید درد ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی نہیں کھل رہی
تھیں۔ بدری ناتھ کی آمد نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ ایک لمحے کیلئے
دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ان خوابناک آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ بدری
ناتھ پر جیسے بجلی سی گری۔ اس نے جھرجھری لے کر خود کو سنبھالا' پلٹ کر ایک گلاس
میں اس فاریسٹ آفیسر سے پانی مانگا۔ وہ کمرے سے باہر گیا تو بدری ناتھ کی
نظریں اس عورت کے پرکشش بدن پر جم گئیں۔ تپسیا بھنگ ہونے لگی۔ ریاضت
خاک میں ملنے لگی۔ آگے بڑھ کر اس نے سر سے بندھی پٹی کھول دی اور اس کے

ریشمیں بالوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ فوراً ہی درد کی شدت کم ہو گئی۔ عورت نے اپنے
دونوں ہاتھوں سے بدری ناتھ کے ہاتھوں پر دباؤ ڈالا۔ شاید وہ بدری ناتھ کو دباؤ
ڈال کر درد کی جگہ دکھانا چاہتی تھی۔ اتنے میں اس کا شوہر ایک گلاس میں پانی لے
آیا۔ بدری ناتھ کو اپنی بیوی کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور بیوی کے چہرے پر سکون
پھیلتے دیکھ کر اس نے سکھ کا سانس لیا۔ بدری ناتھ کو اس نے بڑی عقیدت سے
دیکھا اور گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ بدری ناتھ نے گلاس ایک طرف رکھنے کا
اشارہ کیا اور اس عورت کے بالوں میں آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر
میں درد بالکل ہی ختم ہو گیا اور وہ عورت ایسی ہشاش بشاش ہو گئی جیسے اسے کچھ ہوا
ہی نہ تھا۔ فاریسٹ آفیسر بہت خوش ہوا اور اس نے بدری ناتھ سے کچھ پیسے لینے
کی التجا کی۔ بدری ناتھ نے اسے بتایا کہ یہ کام وہ پیسے کیلئے نہیں کرتا بلکہ من کی
شانتی کیلئے کرتا ہے اور یہ کہہ کر وہ اپنے دل میں ہزاروں طوفان چھپائے وہاں
سے آ گیا۔ وہ پوری رات انگاروں پر لوٹتا رہا۔ نفس کا گھوڑا بے لگام ہو کر اسے
جانے کس کس جگہ کی سیر کراتا رہا۔ وہ خواہشوں کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارتا
جانے کتنی گہرائی تک چلا گیا۔ صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور پوجا کا
وقت نکل چکا تھا۔ پوجا کا وقت نکل جانے کی اسے ذرا بھی پروا نہ تھی۔ وہ اس
عورت کے پرکشش بدن کی بھول بھلیوں میں گم تھا۔ وہ عورت اس کے دماغ میں
تھرکتی پھر رہی تھی۔''

''ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے آسن جما لیا اور یہاں سے کئی
میل دور ڈاک بنگلے کو اپنے دھیان میں لے آیا۔ اس نے اپنی بند آنکھوں سے
اس عورت کو رسوئی گھر میں کام کرتے ہوئے دیکھا۔ بنگلے میں اس وقت وہ اکیلی
تھی۔ اس کا شوہر جنگل کے دورے پر نکلا ہوا تھا۔ بدری ناتھ اسے بھی اپنے
دھیان میں لے آیا تب اسے معلوم ہوا کہ فاریسٹ آفیسر کام سے فارغ ہو کر

بنگلے میں بعد دوپہر پہنچے گا۔ ابھی دوپہر ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ بستی سے نکلا تو اسے ایک ٹرک جاتا ہوا نظر آیا۔ وہ اس ٹرک پر بیٹھ کر ڈاک بنگلے سے ذرا فاصلے پر اتر گیا۔ ٹرک ڈرائیور جو بانس لے کر پیلی بھیت جا رہا تھا نے اس نے بدری ناتھ کو اس کی مطلوبہ جگہ تک پہنچانے کی پیشکش بھی کی لیکن وہ اسے مطلوبہ جگہ کا نام بتائے بغیر سڑک پر ہی اتر گیا۔ پھر اس نے ڈاک بنگلے کا ایسا راستہ اختیار کیا جو جنگل سے گزر کر اس تک پہنچتا تھا۔''

''فاریسٹ آفیسر کی بیوی نے جب غیر متوقع طور پر بابا کے چیلے کو ڈاک بنگلے کے دروازے پر دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ایک پتی ورتا پتنی تھی۔ بدری ناتھ نے اسے کھیر سمجھا تھا اور جو تھی بھی کھیر لیکن ٹیڑھی۔ اس بات کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب اس نے اسے اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ اس عورت نے بھرپور مزاحمت کی لیکن بدری ناتھ جیسے پاکھنڈی کی گرفت سے نکلنا کوئی آسان کام نہ تھا وہ اس صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بے ہوش ہو جانے کے بعد بدری ناتھ کو ہوش آیا لیکن اب کیا تھا ہر سو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس نے بے ہوش پڑی عورت کو بڑی پریشانی سے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس عورت کے ہوش میں آتے ہی اس کا پاپ دنیا پر عیاں ہو جائے گا لہٰذا اس نے ایک پاپ کو چھپانے کیلئے ایک اور پاپ کرنے کا ارادہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت کی لاش ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس نے ان ٹکڑوں کو ایک بوری میں بھرا اور بوری کندھے پر لاد کر جنگل میں گم ہو گیا اور اس کی لاش ٹھکانے لگا کر اپنی کٹیا میں آ گیا۔''

''ابھی شام گہری نہ ہوئی تھی کہ فاریسٹ آفیسر دو تین مزدوروں کے ساتھ اس کی کٹیا پر آ پہنچا۔ وہ بے حد پریشان تھا اور کیوں نہ ہوتا اس کی بیوی گم ہو گئی تھی اور اس نے تمام ممکنہ جگہوں پر اسے تلاش کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ جنگل بھی

چھنوا مارا تھا۔ مایوس ہو کر اس نے بدری ناتھ کی کٹیا کا رخ کیا کہ شاید وہ اپنے کشف سے اسے کچھ بتا سکے۔''

بدری ناتھ نے اس کی بیوی کی گمشدگی کی خبر کو بڑے اطمینان سے سنا اور پھر آسن جما کر آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں اور گہری سانس لے کر بولا۔

''اب اسے بھول جاؤ۔ وہ ایک درندے کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔''

بدری ناتھ نے سچی بات کہہ دی لیکن وہ فاریسٹ آفیسر سچی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس نے درندے کو کوئی جنگلی جانور جانا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ درندے انسانوں میں بھی چھپے ہوئے ہیں... فاریسٹ آفیسر نے بہت کوشش کی کہ بدری ناتھ اس سانحہ کی تفصیل بتائے لیکن اس نے یہ کہہ کر اس سے گلو خلاصی کرا لی کہ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا اور یہ بات بھی اس نے سچی کہی تھی اس حادثے کی روداد بتا کر اس نے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا تو نہیں ڈلوانا تھا۔ بالآخر فاریسٹ آفیسر غم سے نڈھال ڈاک بنگلے واپس لوٹ گیا۔ اب یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم نے جو ہاتھ دو بار دیکھا وہ اسی عورت کا ہاتھ تھا۔'' یہ کہہ کر سورج بابا خاموش ہو گئے۔

اس انکشاف نے میرے اندر سنسنی پھیلا دی۔

''آپ کے چیلے بدری ناتھ کو مرے ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''چھبیس سال۔'' سورج بابا نے جواب دیا۔

''ظاہر ہے یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہوگا؟''

''ہاں اس سانحہ کو اٹھائیس سال ہو گئے۔''

''اٹھائیس سال ہو گئے اس بات کو اور وہ ہاتھ اس قدر تازہ ہے جیسے

کچھ ہی دیر پہلے کی بات ہو۔ میں نے زرین میں خود اپنی آنکھوں سے اس میں سے خون نکلتے دیکھا ہے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ پھر وہ ہاتھ زرین میں کیسے پہنچ گیا پھر کہاں غائب ہوا؟ دوبارہ نظر آیا تو وہ لنگورا سے کہاں لے گئے؟'' اس ہاتھ نے مجھے الجھا دیا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے دماغ والے سارے سوالات ایک ساتھ کر ڈالے۔

''اب تم اس ہاتھ کو اپنے دماغ سے نکال دو۔ آج کے بعد سے وہ تمہیں کبھی دکھائی نہ دے گا۔''

''لیکن اب تک کیوں دکھائی دیا؟''

''وہ ہاتھ تم تک کیسے پہنچا' یا وہ اب تک اتنا تازہ کیسے ہے ان باتوں کا تعلق کائنات کے راز سے ہے اور کائنات کے راز میں تم پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ وہ ہاتھ کس کا تھا؟'' سورج بابا نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ اس کے بعد مجھے اس موضوع پر گفتگو کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سورج بابا نے پھر سے بدری ناتھ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

''اس عورت کی زندگی ختم کرنے کے بعد اس نے گناہ کی زندگی اختیار کر لی۔ اس کی کٹیا جو تپسیا کی جگہ تھی پوجا کا استھان تھی۔ شکارگاہ بن گئی۔ اس نے عورتوں اور لڑکیوں کا علاج پانی سے کرنے کے بجائے ہاتھ سے شروع کر دیا۔ عقیدت کی ماری عورتیں اس کے ہاتھوں کی گستاخی کو ہنسی خوشی جھیل جاتیں۔ کنواری لڑکیاں لٹ کر چپ رہتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے حوصلے بڑھتے گئے اور گناہوں کی دلدل میں وہ گردن تک پھنس گیا۔ اس کی حالت اس کتے کی سی ہو گئی جو چوسی ہوئی ہڈیوں پر بھی جھپٹ پڑتا ہے پھر انصاف کی وہ رات آ پہنچی اور

اس کالے ناگ نے بدری ناتھ کا کام تمام کر دیا۔ اس واقعہ کی تفصیلات سے تو تم واقف ہی ہو اور اس کی کٹیا میں اس کی لاش بھی دیکھ چکے ہو۔

''جی ہاں ٹھیکیدار علی بخش نے یہ واقعہ بڑی تفصیل سے مجھے سنایا تھا۔ یہ واقعہ سننے کے بعد ہی ہم مزدوروں کی بستی پہنچے تھے۔ اس دن آپ کی آمد کا بھی شور تھا مجھے آپ کو دیکھنے کا شوق ہوا لیکن بستی میں ہم زیادہ دیر ٹھہر نہ سکتے تھے کیونکہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہم لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس دن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ ہم لوگوں کے وہاں سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد بستی میں آ گئے تھے۔'' میں نے انہیں بتایا پھر ان سے سوال کیا۔

''کیا آپ اس بات سے واقف ہیں کہ بدری ناتھ کی لاش اس کی کٹیا سے غائب ہو چکی ہے اور اس محافظ ناگ کو بھی کسی نے مار ڈالا ہے۔''

''ہاں' میں ان تبدیلیوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ اس ناگ کو کس نے کچلا اور بدری ناتھ کی لاش کہاں غائب ہو گئی؟''

''کہاں غائب ہو گئی ذرا بتائیں تو؟''

''سب معلوم ہو جائے گا ذرا صبر سے کام لو ہاں میں تم سے اس رات کا ذکر کر رہا تا جب بدری ناتھ اپنے انجام کو پہنچا۔ وہ بدری ناتھ جو مجسم ہوس ہو گیا تھا جس کے روئیں روئیں سے عورت' عورت کی آواز آتی تھی اسے ایک کنوری کنیا کے جسم کی گاگر سے رس پیے بنا ہی موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔ وہ لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو زندہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اسے لے کر بستی پہنچ گئی۔ پھر بدری ناتھ کی لاش کے ساتھ کیا ہوا؟ اس ناگ نے لاش کو کیسے روکا؟ ان باتوں سے تم واقف ہو۔ پھر وہ لڑکی اس واقعہ کے چند روز بعد ہی لاپتہ ہو گئی۔ وہ کیسے غائب ہو گئی تھی۔ اس پر کیا بیتی یہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔

☆......☆......☆

وہ کئی روز سے اس لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس تعاقب کے نتیجے میں اسے ان تمام راستوں سے آگاہی ہوگئی تھی جہاں جہاں سے اس لڑکی کا گزر تھا۔ اس دن وہ ایک درخت کے گدے پر گھات لگائے بیٹھا تھا۔ لڑکی اوپر سے بانسوں کا گٹھڑ اٹھانے گئی تھی۔ جب وہ واپس آئی اور اس درخت کے قریب سے گزرنے لگی جس پر وہ گھات لگائے بیٹھا تھا تو اچانک اس لڑکی کو اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ ہی بوجھ محسوس ہوا۔ وہ اس بوجھ تلے دب گئی۔ بانسوں کا گٹھڑ دور کھائی میں جا کر گرا۔ یہ محسوس کر کے کہ کیا چیز اس سے آلپٹی ہے اس کے ہوش گم ہو گئے وہ ایک دراز قد اور توانا ریچھ تھا۔''

''ریچھ...؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ریچھ۔ درمیان میں مت بولو۔ خاموشی سے سنتے جاؤ اس لڑکی کا واسطہ چند روز قبل ہی ایک ریچھ سے پڑا تھا جو انسانی روپ میں تھا اور جس کا نام بدری ناتھ تھا۔ اس ریچھ کو دیکھ کر اسے بدری ناتھ یاد آ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ریچھ کی کھال پہن کر اس کے سامنے آ گیا ہے۔ اس کی روح لرز اٹھی اور وہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔ جب اس کے حواس درست ہوئے وہ ہوش میں آئی تو اس نے خود کو زمین پر لیٹا پایا۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں تو اسے اپنے گرد اندھیرا پھیلا نظر آیا۔ البتہ سامنے سے کچھ روشنی ضرور آ رہی تھی۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ کسی غار میں ہے۔ حواس جاگے تو اسے پاؤں میں گدگدی محسوس ہوئی۔ ذرا سا سر اونچا کر کے دیکھا تو ریچھ کو اپنے پاؤں کے قریب بیٹھا ہوا پایا۔ وہ اپنی لمبی زبان سے اس لڑکی کے تلوے چاٹ رہا تھا۔ وہ باوجود کوشش کے اپنے پاؤں اس کے سامنے سے ہٹا نہ سکی۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ یہ عمل تین دن تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس لڑکی کے تلوؤں سے خون رسنے

لگا۔ اس دوران اس نے ایک آدھ بار بھاگنے کی کوشش کی لیکن تلوؤں کے زخموں نے اسے فرار نہ ہونے دیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر بے جان ہو کر گر پڑی۔ جب ریچھ واپس آیا تو اس نے اسے غار سے ذرا سے فاصلے پر نڈھال لیٹا ہوا پایا۔ تب اس نے شہد کا چھتا اس لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ تین دن میں پہلی بار اس لڑکی کو کچھ کھانے کو ملا تھا۔ چھتے میں اچھا خاصا شہد موجود تھا۔ لڑکی نے سیر ہو کر کھایا۔ پیٹ میں کچھ پڑا تو اس پر نیم غشی سی طاری ہوگئی۔ تب وہ ریچھ اسے اٹھا کر پھر سے غار میں لے آیا۔ چند ہی روز میں لڑکی معذور ہو کر رہ گئی۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہوگیا۔ وہ لڑکی دس ماہ تک اس خبیث کے پاس رہی بالآخر ایک بچے کو جنم دے کر وہ پرلوک سدھاری۔ اس کی موت کے بعد وہ ریچھ بھی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا اور وہ بچہ فطرت کی گود میں پل کر جوان ہوا۔ تم نے جس ریچھ انسان کو دیکھا ہے دراصل وہ وہی بچہ ہے۔ انوکھے ملاپ سے پیدا ہوا۔ اب تک وہ ریچھ انسان اندرون جنگل ہی گھومتا پھرتا تھا لیکن پچھلے چند دنوں سے اس میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی ہے اور اب وہ انسانوں کے علاقوں میں بھی گھومنے لگا ہے۔ اسی لیے وہ تمہاری نظروں میں آ گیا اور اسے محض اتفاق سمجھو۔'' یہ کہہ کر سورج بابا کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئے۔

اگرچہ سورج بابا نے بڑی تفصیل سے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اس انکشاف پر یقین نہ آیا۔ میں نے اس جنگل میں پیش آنے والی بہت سی ناقابل یقین باتوں پر یقین کر لیا تھا لیکن یہ بات گلے سے اترنی مشکل ہوگئی تھی کہ ایک انسان اور جانور کے اتصال سے اس قسم کی اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس وقت اس بات پر یقین کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''بدری ناتھ کی لاش کا معمہ تو پھر بھی حل نہیں ہوا؟'' میں نے سورج بابا کو یاد دلایا۔ ''اسے کون اٹھا کر لے گیا؟''

''وہی بے وقوف اٹھا لایا ہے اسے جس کا نام تم نے ریچھ انسان رکھا ہوا ہے۔''

سورج بابا نے کہا جب تم لوگ اسے مارنے کیلئے جنگل میں گھوم رہے تھے تو وہ تم سے بہت دور اس کارروائی میں لگا ہوا تھا۔ اس نے ناگ کو اپنے پاؤں سے کچلا اور اس کی لاش کو اٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے گیا۔''

''اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟''

''وہی غار جہاں وہ پیدا ہوا اور پل بڑھ کر اس عمر کو پہنچا۔ اب ایک خاص بات تمہیں بتاتا ہوں۔ اس ریچھ انسان کی میں مزید نگرانی نہیں کر سکتا۔ اسے میں نے اب تک تو روک کے رکھا تھا۔ وہ ایک محدود علاقے سے آگے نہیں بڑھتا تھا لیکن پچھلے دنوں میں بڑی خطرناک تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ وہ باغی ہو گیا ہے۔ اس نے علاقے کی خلاف ورزی کے ساتھ ساتھ جارحانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ بدری ناتھ کی لاش وہاں سے اٹھا لانا اسی بغاوت کا شاخسانہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی عورت کا قرب اگر اسے حاصل ہو گیا تو وہ پھر انسانی بستیوں میں تباہی مچا دے گا۔ کوئی عورت اس کے شر سے محفوظ نہیں رہے گی۔ میرے پاس وقت نہیں مجھے اپنے گیان دھیان سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ میں اب اس کے پیچھے پیچھے نہیں پھر سکتا اب تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔'' یہ کہہ کر سورج بابا چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گئے۔

میں سوالیہ نشان بن کر انہیں تکنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد وہ گویا ہوئے اور مجھے تفصیل سے بتایا کہ کیا کرنا ہو گا اور کیسے کرنا ہو گا۔ میں ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا رہا اور گرہ میں باندھتا رہا۔

جب سورج بابا سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے چلتے ہوئے مجھے ایک پتھر تحفے میں دیا۔ یہ پیلے رنگ کا چمکدار پتھر کبوتر کے انڈے جتنا تھا۔ میں

نے بڑی حفاظت سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''یہ پتھر تمہیں میری موت کی اطلاع دے گا۔'' سورج بابا نے کہا تھا۔

میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ یہ پتھر کس طرح موت کی اطلاع دے گا۔ یہ بات میں ان سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس اس مسئلے پر میں غور کرتا ہوا سورج بابا کی کٹیا سے نکل آیا۔

پہاڑی سے نیچے اترتے ہی راہبر 'کھوں' 'کھوں' کرتا میرے سامنے آ گیا اور میں جنگل کی بھول بھلیوں میں اس لنگور کے پیچھے چلتا رہا۔

چار پانچ گھنٹے کی اذیت ناک مسافت کے بعد میں گرتا پڑتا اس جگہ پہنچ گیا جہاں رئیس بھائی نے لنگور کو ہلاک کیا تھا۔ اس جگہ سے سڑک تک پہنچنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس راستے کو میں اچھی طرح پہچان گیا تھا لیکن مسئلہ سڑک تک پہنچنے کا نہ تھا بلکہ سڑک سے پڑاؤ تک پہنچنے کا تھا اور وہاں بغیر گاڑی کے پہنچنا قطعاً ناممکن تھا اور اس ویران سڑک پر کسی سواری کا ملنا محال تھا۔

سورج بابا نے چلتے ہوئے بتایا تھا کہ تمہیں سڑک پر گاڑی مل جائے گی۔ بس میں اس یقین دہانی کے سہارے سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ لنگور واپس جا چکا تھا۔

جب میں درختوں کے جال سے نکل کر سڑک پر آیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ رئیس بھائی سڑک کے کنارے جیپ میں بیٹھے اسی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے میں درختوں کے جھنڈ سے باہر آیا تھا۔

مجھے دیکھ کر انہیں بھی بڑی حیرت ہوئی۔ وہ جیپ سے کود کر میری طرف لپکے۔ بھاگ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے بولے۔

''یار تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''رئیس بھائی میں راستہ بھول گیا تھا۔ بس خیر ہو گئی کہ آپ کو زندہ

سلامت نظر آ رہا ہوں ورنہ اس جنگل میں آپ کو ہڈیاں بھی نہ ملتیں۔

''آؤ جلدی آؤ...... گاڑی میں بیٹھو۔''

''چچا جان کا تو برا حال ہو گا۔''

''میں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔''

''بہت برا حال ہے ان کا۔ وہ خود کو مجرم تصور کر رہے ہیں۔ بس بار بار یہی کہتے ہیں کہ میں نے اسے اکیلا کیوں جانے دیا کیوں اس پر اعتماد کر لیا۔''

''آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا انتظار۔''

''آپ کو کیسے یقین تھا کہ میں یہاں مل جاؤں گا۔''

''یقین تو مجھے نہیں تھا بس کوئی چیز مجھے یہاں کھینچ لائی۔ بار بار میرے دل میں لہر سی اٹھتی تھی کہ میں اس جگہ چل کر دیکھوں اس خیال نے اس قدر زور پکڑا کہ میں غیر ارادی طور پر گاڑی ڈرائیو کرتا یہاں آ نکلا اور اس طرح انتظار کرنے لگا جیسے ابھی تم ان درختوں سے نکلنے والے ہو اور واقعی تم یہاں سے نکل آئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔'' رئیس بھائی نے گاڑی سٹارٹ کی۔

جب میں نے اس گورکھ دھندے کو حل کرنا شروع کیا اور رئیس بھائی کو جنگل میں بتائے ہوئے لمحات کی پوری جزویات کے ساتھ روداد سنائی تو کئی جگہ انہوں نے میری آپ بیتی سنتے سنتے بریک پر پاؤں مارا اور بولے۔''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''لیکن میں نے انہیں گاڑی روکنے نہ دی۔'' کہا چلتے رہیے اور میری باتیں صبر سے سنتے رہیے۔

پھر رئیس بھائی بغیر گاڑی روکے میری باتیں سنتے رہے اور حیرت سے

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھتے رہے۔ بالآخر میری ''طلسم ہوشربا'' انجام کو پہنچی اور انہوں نے ایک گہری سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔ شاید وہ خدا سے ان عجائبات جنگل کے بارے میں کوئی مکالمہ کر رہے تھے۔

ہم پڑاؤ کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اگر میں اچانک رئیس بھائی کو ہشیار نہ کر دیتا تو منشی آج گیا تھا جان سے۔ ایک تو رئیس بھائی کی توجہ سڑک پر نہ تھی۔ دوسرے اس منشی کو بھی اپنی جان زیادہ عزیز نہ تھی۔ وہ اچانک ہی سامنے آ گیا تھا۔ رئیس بھائی نے بڑی مہارت سے گاڑی بچائی اور پھر منشی پر برسنے کو تھے کہ منشی نے ایک ہولناک خبر سنائی۔

☆....☆....☆

''صاحب جی! غضب ہوگیا۔'' منشی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا منشی؟'' رئیس بھائی کے بجائے میں اس سے مخاطب ہوا......!

مجھے دیکھ کر چند لمحوں کو اس کے چہرے پر خوشی لہرائی۔ وہ جوش سے بولا:

''آپ کہاں چلے گئے تھے' صاحب جی؟''

''یہ تمہیں پھر بتاؤں گا تم پہلے اپنی افتاد بیان کرو۔'' میں نے کہا۔

''وہ اٹھا لے گیا جی اس لڑکی کو۔'' منشی پر بوکھلاہٹ طاری تھی۔

''کون اٹھا لے گیا؟'' رئیس بھائی چونک پڑے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

''وہی ریچھ انسان۔'' منشی کے لہجے میں لرزش تھی۔

''کس لڑکی کو اٹھایا اس نے اور کہاں سے؟''

''صاحب جی وہاں نالے پر دونوں لڑکیاں اپنے کپڑے دھونے گئی تھیں۔ وہی لڑکیاں جن کا آپ لوگوں نے رقص دیکھا تھا......!''

''اچھا وہ' جنہوں نے ہمارے گلے میں ہار ڈالے تھے؟'' مجھے فوراً وہ چاندی بدن لڑکیاں یاد آ گئیں۔

''ہاں جی وہی۔'' یہ کہہ کر منشی نے جلدی جلدی داستان الم سنائی۔

''ہمارے پڑاؤ کے نزدیک جو مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں' وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک نالہ بہتا تھا۔ یہ نالہ مزدور عورتوں کے استعمال میں تھا

اور کیونکہ سارے مزدور جانتے تھے کہ ان کی عورتیں نالے پر جا کر نہاتی دھوتی ہیں' لہٰذا اس طرف سے کوئی مرد نہ گزرتا تھا۔ پھر بھی وہ عورتیں اور لڑکیاں نالے میں پڑے بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں نہاتیں۔ اتنی دیر میں ان کے کپڑے سوکھ جاتے' تو وہ کپڑے پہن کر واپس آ جاتیں۔ وہ دونوں لڑکیاں بھی اسی غرض سے نالے کی طرف گئی تھیں وہاں جا کر انہوں نے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں اپنے کپڑے اتار کر دھوئے اور سکھانے کے لیے پھیلا دیئے۔ پھر وہ دونوں نہانے لگیں۔ وہ ریچھ انسان جانے کب سے ان کی گھات میں تھا۔ اس نے ایک لڑکی پر حملہ کردیا اور اسے کاندھے پر ڈال تیزی سے درختوں میں غائب ہوگیا۔ وہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ اس عفریت کو دیکھ کر تو ان کے ہوش گم ہوگئے۔ نالے پر رہ جانے والی لڑکی کو دور تک اپنی بہن کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ وہ جلدی سے اس کے کپڑے سمیت' اپنے کپڑے پہن' گرتی پڑتی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔ بالآخر یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سارے مزدور کام چھوڑ کر ایک جگہ اکٹھا ہوگئے۔ چچا جان میری گمشدگی کی بنا پر پہلے ہی کیا کم پریشان تھے کہ اس ہولناک خبر نے انہیں دل پکڑنے پر مجبور کردیا۔ پڑاؤ میں رئیس بھائی بھی موجود نہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے منشی کو دوڑایا کہ وہ رئیس بھائی کو تلاش کرے اور وہ یوں گرتا پڑتا' اچانک ہماری جیپ کے سامنے آ گیا تھا۔''

اس ہولناک خبر نے ہم دونوں کی بھی سٹی گم کردی تھی۔ سورج بابا کا خدشہ سچ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ریچھ انسان عورت کا قرب حاصل کرکے انسانی بستیوں میں تباہی مچانے کو تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' رئیس بھائی کی پیشانی پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

''اس لڑکی کو تو شاید ہم لوگ نہ بچا سکیں' لیکن آیندہ وہ کسی لڑکی کو تباہ نہیں کر سکے گا۔'' میں نے بڑے یقین سے کہا۔ ''رئیس بھائی آپ ایسا کریں کہ مجھے

یہیں گاڑی سے اتار دیں اور کرم الٰہی' فضل الٰہی کے پاس آپ چلے جائیں۔ کل کا پروگرام آپ پکا کرلیں۔ میں پڑاؤ میں جا کر صورتحال دیکھتا ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم پڑاؤ میں جا کر مزدوروں کو تسلی دو' میں ان لوگوں سے ملاقات کر کے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر رئیس بھائی نے گاڑی بیک کی اور اسے راکٹ کی طرح اڑاتے آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

جب میں پڑاؤ میں پہنچا' تو وہاں میں نے عجیب صورت حال دیکھی۔ سارے مزدور چچا جان کو گھیرے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی ان مزدوروں کی نظر مجھ پر پڑی' انہوں نے چچا جان کو اشارہ کیا۔ چچا جان نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مجھے سامنے پایا تو گویا ان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ میری طرف لپکے' میں ان کی طرف دوڑا۔ نزدیک پہنچا تو چچا جان نے مجھے بانہوں میں بھرلیا۔

''کیا ہوا تھا تمہیں؟ کہاں چلے گئے تھے تم؟''

''چچا جان راستہ بھول گیا تھا میں اور یہ راستہ بھول جانا ہمارے حق میں اچھا ہوا۔ میں جنگل سے بڑے راز لایا ہوں۔ آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تب ہی کچھ فاصلے سے ایک دلخراش چیخ سنائی دی اور پھر کوئی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ یہ کس پر غم کے پہاڑ ٹوٹے ہیں میرے پاس اس کی بلکتی بہن کو تسلی دینے کے لیے کچھ بھی نہ تھا' الفاظ بھی نہیں۔

پھر میں نے چچا جان کو الف سے لے کر یے تک پوری کہانی سنائی۔ انہیں بتایا کہ میں نے جنگل میں گم ہوکر کیسے رات گزاری اور پھر میں کس طرح سورج بابا تک پہنچا اور سورج بابا نے کیا کیا انکشافات کیے اور اس ریچھ انسان سے نجات کا کیا طریقہ بتایا۔ پھر میں نے اپنی جیب سے سورج بابا کا دیا ہوا تختہ نکالا۔

چچا جان نے اس زرد پتھر کو الٹ پلٹ کر بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اس کی چمک دمک سے خاصے متاثر ہوئے۔

میں نے چچا جان کو رائے دی کہ وہ مزدوروں کو جا کر تسلی دیں اور انہیں بتائیں کہ کل اس ریچھ انسان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا اور ان کی لڑکی اس کے چنگل سے چھڑا لی جائے گی۔ پھر انہیں سورج بابا کا یہ تختہ بھی دکھا دیں۔ یہ لوگ ان کے عقیدت مند ہیں۔ اس پتھر کی زیارت انہیں سکون پہنچائے گی۔

میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ چچا جان نے جب سارے مزدوروں کو اکٹھا کر کے میرے بارے میں بتایا کہ میں سورج بابا سے مل کر آیا ہوں' تو ان کے سر میرے سامنے عقیدت سے جھک گئے۔ پھر چچا جان نے اس عفریت سے نجات اور لڑکی کی بازیابی کی نوید دی تو ان کے چہروں پر روشنی پھیل گئی۔ آخر میں چچا جان نے تھیلے سے بلی باہر نکالی۔ اس پتھر نے لوگوں میں ہلچل مچا دی۔ ہر مزدور نے اسے بڑی عقیدت سے چوما اور مطمئن چہرے لیے اپنی جھونپڑیوں میں چلے گئے۔

مزدوروں کے جانے کے بعد چچا جان اور میں نے سکھ کا سانس لیا اور بستر پر لیٹ کر کل کے ہنگامہ خیزیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو شام نہیں رات ہو چکی تھی۔ رئیس بھائی واپس آ چکے تھے اور وہ چچا جان سے اسی عفریت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ دونوں میری طرف متوجہ ہوگئے۔

''بیٹے! جا کر منہ ہاتھ دھولو کھانا تیار ہے۔'' چچا جان نے کہا۔

''جی اچھا!'' میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر رئیس بھائی سے مخاطب ہوکر بولا: ''کیا رہا......؟''

''بات کر آیا ہوں ان سے۔ وہ دونوں اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ کل صبح اس جگہ پہنچ جائیں گے۔''

''خوفزدہ تو نہیں تھے؟''

''نہیں... البتہ تمہاری طلسم ہوشربا نے انہیں حیران بہت کیا۔'' رئیس بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ لوگ اس دن کیوں نہیں آئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''فضل الٰہی کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی تھی۔'' رئیس بھائی نے بتایا۔

''اب کیا حال ہے؟''

''ٹھیک تھا وہ۔''

''صاحب جی! کھانا لے آؤں کیا؟''

''ہاں' لاؤ فوراً... میں ایک منٹ میں ہاتھ منہ دھو لیتا ہوں۔'' میں یہ کہہ کر جھونپڑی سے باہر نکلا۔ درخت تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ہوا ان کے اوپر سے سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھی۔

میں نے باہر رکھی لالٹین کی روشنی میں ٹینکی کے پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ منشی میرے پیچھے تولیہ لیے کھڑا تھا۔ میں تولیہ سے ہاتھ پونچھتا اندر آ گیا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ بہت دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ آنے والے کل کے بارے میں پروگرام طے ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

صبح اٹھتے ہی میں نے بندوق سنبھالی' سارے طاقتور کارتوس پیٹی میں لگائے اور پیٹی گلے میں ڈال کر جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ باہر چند مزدور ہمارے منتظر تھے۔ ان سبھوں نے ہاتھ میں نیزے اٹھائے ہوئے تھے۔ تیز اور چمکتے ہوئے۔

کھلی جیپ میں ہم نے ان مزدوروں کو ٹھونسا اور اس مقام کی طرف روانہ ہوئے' جہاں ہم نے ایک لنگور مارا تھا۔

کرم الٰہی اور فضل الٰہی سے اسی مقام پر ملاقات ٹھہری تھی اور یہیں سے ہم لوگوں نے اپنی مہم کا آغاز کرنا تھا۔

ہم جب اس مقام پر پہنچے تو ہمیں دور ہی سے ''الٰہی برادران'' کی جیپ کھڑی نظر آ گئی۔ ان کے ساتھ جو مزدور آئے تھے' وہ نیزے ہاتھ میں پکڑے سڑک پر بیٹھے تھے اور کرم الٰہی' فضل الٰہی ایک درخت کے نیچے رائفلیں لٹکائے محوِ گفتگو تھے۔

ہمیں دیکھ کر سب ایک جگہ سمٹ آئے۔ مزدور' مزدوروں میں مل گئے اور ہم لوگ ایک طرف ہوکر ایک دوسرے کا حال چال پوچھنے لگے۔

بعد خیریت کے کرم الٰہی نے سب سے پہلے مجھ سے جو سوال کیا وہ یہ تھا:

''آپ کو غار تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہے؟''

''نہیں! آپ غار کی بات کر رہے ہیں' مجھے تو سورج بابا کی کٹیا تک جانے کا راستہ یاد نہیں جنگل کی بھول بھلیوں میں راستہ یاد رکھنا اتنا آسان کہاں؟''

''پھر ہم وہاں تک کیسے پہنچیں گے؟''

''پہنچ جائیں گے' فکر کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے بڑے یقین سے کہا۔

''راستہ معلوم نہ ہونے کے باوجود؟''

''ہاں... !''

''ولی اللہ ہو گئے کیا؟'' مجھ پر چوٹ کی گئی۔

''اپنے ایسے نصیب کہاں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا

''یار! کیوں پریشان کر رہے ہو؟ اصل بات بتا کیوں نہیں دیتے؟''

''مجھے یہ راز کھولنے سے سختی سے منع کر دیا گیا ہے'' میں نے سنجیدگی سے

کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ اب بولو کیا کرنا ہے؟''

''کرنا کیا ہے۔ بس اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو جانا ہے۔ میں سب سے آگے چلوں گا' کوئی تیس چالیس قدم آگے۔ آپ سب لوگ میرے پیچھے آئیں گے اور یہ فاصلہ اس وقت تک برقرار رہے گا' جب تک ہم منزل تک نہ پہنچ جائیں میرے پیچھے چلتے ہوئے اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنی ہیں یہ ضروری نہیں کہ اس سے ہماری ملاقات غار ہی میں ہو' ممکن ہے وہ ہمیں راستے میں ہی کہیں مل جائے۔ ٹھیک ہے۔ اب آپ لوگ آئیں میرے پیچھے۔'' یہ کہہ کر میں نے جنگل میں قدم رکھا۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں غار تک کس طرح پہنچوں گا۔ سورج بابا نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ تمہیں غار تک پہنچانے کا ذمہ میرا۔ بس تم اسی جگہ پہنچ جانا' جہاں لنگور مارا تھا۔ پھر تمہیں راہ نما خود بخود نظر آ جائے گا اور جو کچھ نظر آئے' اسے راز ہی رکھنا۔

جنگل میں قدم رکھتے ہی مجھے ''کھوں کھوں'' کی آواز سنائی دی اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو حضرت جی' کو بیٹھا پایا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے دانت نکوسے' گویا خوش آمدید کہا اور دوسرے درخت پر چھلانگ لگا دی۔

میں نے فوراً ہی وہ راہ پکڑ لی اور سب لوگوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ وہ لنگور مجھ سے تیس چالیس قدم آگے تھا اس لئے بعض وقت وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تھا' گھنے درختوں میں اسے ڈھونڈنا مشکل ہوتا۔ پھر پیچھے والوں کو کیوں کر دکھائی دیتا۔ سارے لوگ اسی شش و پنج میں تھے کہ میں اتنی تیزی سے کس بنیاد پر آگے بڑھا چلا جا رہا ہوں۔ خدا کا

شکر ہے کہ کسی نے اس راز کو پانے کے لیے کوئی بے قاعدگی نہیں کی۔ رئیس بھائی کو بھی اب میری اس تحریر سے معلوم ہوگا کہ وہ کیا چیز تھی' جس کے پیچھے چل کر میں غار تک پہنچا۔

خیر! ہم لوگ دو گھنٹے کی دشوار گزار مسافت طے کر کے بالآخر اس غار تک پہنچ ہی گئے۔ راستے میں اس عفریت سے کہیں ملاقات نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے' اس چاند بدن لڑکی کے قرب نے جنگل کی دنیا فراموش کرا دی ہوگی۔ اس وقت تو اس پر جنون اور وحشت طاری ہوگی۔ جانے اس نے اس لڑکی کا کیا حشر کیا ہوگا؟ جانے وہ کس حال میں ہوگی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فوراً ایک چیخ سنائی دی اور یہ دلدوز کراہ اسی لڑکی کی تھی۔ اس دردناک چیخ کو سن کر مزدوروں میں اشتعال پھیل گیا۔

تب میں نے ایک نوجوان' کسیلے بدن مزدور کو ایک درخت سے پھسل کر غار کے دہانے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ شاید وہ اس لڑکی کا قریبی رشتہ دار تھا اور اس چیخ نے اسے اس حد تک نڈر بنا دیا تھا کہ وہ تن تنہا موت کے منہ میں جا رہا تھا۔

''رک جاؤ'' میں نے ڈانٹ کر کہا۔

وہ میری آواز سنتے ہی سہم کر رک گیا۔ میں نے اسے فوراً اپنی جگہ واپس جانے کا اشارہ کیا۔ چند لمحے اس نے توقف کیا۔ شاید کچھ سوچا اور پھر سوچ کر درخت کی طرف بڑھنے لگا۔

میں' رئیس بھائی' کرم الٰہی اور فضل الٰہی نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس غار کو گھیرے میں لے لیا تھا ہم الگ الگ درختوں پر بیٹھے تھے' اس طرح کہ غار کا دہانہ صرف نظر آتا تھا ہر ایک کے ساتھ دو' دو' چار' چار نیزہ بردار مزدور تھے کچھ مزدوروں کو میں نے مختلف درختوں پر پھیلا دیا تھا اور اس بات کے منتظر تھے

کہ وہ غار سے برآمد ہو۔ درختوں پر بیٹھ کر بھی اگرچہ ہم لوگ اس عفریت کی دسترس سے محفوظ نہ تھے۔ کیونکہ درختوں پر چڑھنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بس درختوں پر بیٹھ کر ہم خود کو ذرا سا محفوظ سمجھ رہے تھے' کیونکہ زمین پر کھڑے ہونے اور درختوں پر چڑھ کر بیٹھنے میں بہرحال فرق تھا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے غار سے کیسے نکالا جائے۔ لیکن یہ مسئلہ خود بخود حل ہوگیا۔ جب میں نے اس نوجوان مزدور کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر زور سے ڈانٹا اور رک جانے کا حکم دیا' تو غیرارادی طور پر میری آواز خاصی تیز تھی اس آواز نے غار کے اندر موجود لڑکی کو چونکا دیا۔ چند لمحے بعد ہی ہمیں غار کے دہانے پر اس لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ بس چند ثانیوں کو پھر جیسے کسی نے اسے پیچھے سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ لڑکی کی متواتر چیخیں سنائی دیں اور یہ آوازیں دور ہوتی گئیں۔

ہم لوگوں کے سانس رک گئے۔ میں اپنی بندوق کو کندھے سے لگائے غار کے دہانے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ وہ لمحے عجیب دل ہلا دینے والے تھے۔

تب تیزی سے کوئی چیز برآمد ہوئی۔ غار سے نکل کر اس نے کمر سیدھی بھی نہ کی تھی کہ تڑاتڑ' تڑاتڑ گولیاں برسنے لگیں۔

ہم چاروں میں ایک بھی پیشہ ور شکاری نہ تھا لیکن آپ یقین جانیں اس دن ہماری ایک گولی بھی ضائع نہ ہوئی۔ ساری کی ساری اس ریچھ انسان کے جزو بدن ہوگئیں اور وہ گولیوں کی پہلی بوچھاڑ پر ہی زمین پر آ رہا۔

پھر وہ ہمارے لیے تختہ مشق بن گیا ہم چاروں نے نشانے لے لے کر اس کے جسم کو چھلنی کر دیا۔ جب اس بات کا یقین ہوگیا کہ اب اس میں زندگی کی رمق بھی باقی نہیں رہی' تو ہم سب درختوں سے اتر آئے۔

زمین پر پاؤں رکھتے ہی میں نے ایک شور سا سنا اور جب پیچھے مڑ کر دیکھا

تو تمام مزدوروں کو اس عفریت کی لاش کی جانب بھاگتے دیکھا۔

رئیس بھائی نے انہیں روکنے کی کوشش کی' لیکن میں نے رئیس بھائی سے کہا: ''جانے دیں' انہیں بھی اپنا غصہ نکالنے دیں اب اس میں زندگی کے آثار بالکل نہیں۔''

جب ہم لوگ اس عفریت کی لاش کے نزدیک پہنچے تب تک وہ مزدور اپنے نوکیلے' تیز اور چمکتے نیزوں سے اس کا جسم اچھی طرح گود چکے تھے۔

پھر میں نے اس نوجوان کو غار میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا' جسے میں نے شروع میں روک دیا تھا۔

ابھی اس نوجوان کو اندر گئے ہوئے مشکل سے چند لمحے گزرے تھے کہ وہ غار سے برآمد ہوتا نظر آیا۔ میرے قریب آ کر اس نے مجھ سے ٹارچ مانگی اور اپنی قمیص اتار کر منہ پر باندھی اور پھر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اس لڑکی کو اندر سے نکال لایا۔ لڑکی ابھی زندہ تھی۔ لیکن مردوں سے بھی بدتر حالت میں۔ اس کے تلوؤں سے خون ٹپک رہا تھا۔ جسم لہولہان تھا اور کپڑوں کی دھجیاں جسم پر ادھر ادھر چپکی ہوئی تھیں۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہ گئی۔ میں نے فوراً اپنا منہ پھیر لیا۔

غار کے اندر اس قدر بدبو تھی کہ باوجود ناکوں پر رومال باندھنے کے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ہم لوگوں نے جلدی جلدی غار پر یہاں سے وہاں تک نظر ڈالی اور گھبرا کر باہر آ گئے۔ کھلی فضا میں دو چار لمبے لمبے سانس لیے تو حواس قابو میں آئے۔

غار میں بابا کے چیلے کی بھی لاش موجود تھی' جسے اس عفریت نے مسخ کر دیا تھا۔ بابا کے پیپے کے برابر ایک ڈھانچہ پڑا تھا۔ شاید یہ اس لڑکی کا تھا۔ جسے ریچھ جنگل سے اٹھا لایا تھا۔ اس کے برابر ریچھ کی لاش تھی۔ بس بال ہی بال رہ گئے

تھے، اس میں۔

سورج بابا کے حکم کے مطابق میں نے اس عفریت کی لاش کو اٹھوا کر غار میں ڈلوایا اور پھر ان مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ اس غار کو پتھروں سے بند کردیں۔ جفاکش مزدوروں نے بہت جلد یہ کام کردکھایا۔

اور یوں اس غار میں چار لاشیں ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئیں وحشت اور انسانیت سوز حرکتوں کا ایک باب تمام ہوا۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔

اب ایک مسئلہ اس لڑکی کو پڑاؤ تک پہنچانے کا تھا۔ اس مسئلے کو ان مزدوروں نے خود ہی حل کرلیا۔ انہوں نے بانسوں کی ایک چارپائی سی بنائی اور اس لڑکی کو اس پر لٹا کر اسے چار مزدوروں نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور واپس چلنے کے لیے میرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

میں نے آس پاس کے درختوں پر بڑی تیزی سے نظر دوڑائی۔ لیکن اس لنگور کا دور تک پتا نہ چلا۔ میں لنگور کے بغیر چالیس قدم بھی جنگل میں نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے تذبذب کے عالم میں دیکھ کر رئیس بھائی نے پوچھا:

''کیا مسئلہ ہے، اب واپس چلیں؟''

''مجھے تو راستہ یاد نہیں۔''

میری بات سن کر کئی مزدوروں نے بیک وقت کہا کہ راستے کی آپ فکر نہ کریں۔ ہم آپ کو گاڑیوں تک پہنچائیں گے۔ ہمیں راستہ یاد ہے۔

''پھر انتظار کیسا، چلو؟'' میں نے کوچ کا اعلان کیا اور یوں ہمارا قافلہ شاداں و فرحاں واپس اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

ان مزدوروں کو واقعی وہ راستہ یاد تھا اور کیوں نہ ہوتا ان کی زندگی ہی جنگلوں میں گزری تھی۔ وہ جنگل کی رگ رگ سے واقف تھے۔ واپسی پر انہوں نے کئی جگہ اپنے تجربے سے شارٹ کٹ نکالے اور دو گھنٹے کی مسافت ہم نے

صرف ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرلی۔

ہماری گاڑیاں سڑک پر بحفاظت کھڑی تھیں۔ طے یہ ہوا کہ اس زخمی لڑکی کو پڑاؤ پر لے جانے کے بجائے مزدوروں کی بستی پہنچایا جائے۔ وہاں سے فوری طور پر طبی امداد مل سکتی تھی۔ یہ کام فضل الٰہی اور کرم الٰہی کے سپرد کیا تھا کہ وہ لڑکی کو بستی میں چھوڑ کر اپنے علاقے کو واپس ہوجائیں۔ دونوں بھائیوں نے اس کام کو بخوشی قبول کرلیا۔

شام ڈھلنے سے پہلے جب ہم پڑاؤ میں داخل ہوئے، تو پل جھپکتے ہی سارے مزدور ہمارے گرد اکٹھے ہوگئے اور ان مزدوروں سے جلدی جلدی سوال کرنے لگے۔ جو ہمارے ساتھ گئے تھے۔

اپنے بھائیوں کی زبانی عفریت کی موت اور لڑکی کی بازیابی کی خبر سنی تو یہاں سے وہاں تک ہر چہرے پر خوشی ناچنے لگی۔

چچا جان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ان سے زیادہ منشی ادھر سے ادھر اچھلتا پھر رہا تھا۔

پھر چچا جان کو ہم نے اپنا معرکہ سنایا۔ ایک ایک بات تفصیل سے بتائی۔ چچا جان نے ساری باتیں بڑی دلچسپی سے سنیں اور آخر میں ہماری پیٹھ ٹھونکی۔

''بھئی بچو! تم نے کمال کر دکھایا۔''

کمال تو یہ ہوا کہ جس لڑکی کی زندگی کی آس نہ تھی، وہ جی اٹھی۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ وہ جسے زندہ رکھنا چاہے اسے بھلا کون مار سکتا ہے؟ میں جب تک جنگل میں رہا اس لڑکی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ مجھے یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہورہی ہے۔ کسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ رات کو کوئی شخص پانی سے بھری ایک شیشی دے گیا تھا۔ وہ شخص کون تھا، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ بہرحال اس پانی نے زخموں پر مرہم کا کام کیا۔ کسی نامعلوم شخص کا ذکر سن کر میرا

ذہن سورج بابا کی طرف مرتکز ہوگیا۔

ننک پور سے واپسی کے بعد میں کچھ عرصہ بریلی میں رہا اور پھر اپنے شہر علی گڑھ واپس آ گیا۔ سورج بابا کا دیا ہوا وہ زرد پتھر بہت عرصے تک میرے پاس رہا۔ میں اسے جسے بھی دکھاتا' وہ اسے دیکھ کر مسحور سا ہو جاتا۔

☆ ... ☆ ... ☆

اس واقعے کے ٹھیک بارہ برس بعد میں اس پتھر کو ہتھیلی پر رکھے سورج بابا کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ آج مزدوروں کی بستی میں آئے ہوں گے۔ میں چشم تصور سے انہیں بستی میں آتا ہوا دیکھ رہا تھا کہ ایک عجیب حادثہ رونما ہوا۔ وہ پتھر میری ہتھیلی پر رکھے رکھے چار ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا اور اس کی چمک دمک آہستہ آہستہ ماند ہوتی گئی۔ اس کا رنگ بھی اڑ گیا۔ اب میرے ہاتھ پر روکھے پھیکے مٹیالے سے چار ٹکڑے رکھے تھے۔

معاً میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں سورج بابا کا انتقال تو نہیں ہوگیا۔ پتھر دیتے وقت انہوں نے کہا بھی تھا کہ یہ پتھر تمہیں میری موت کی اطلاع دے گا۔

میں نے اسی وقت رئیس بھائی کو خط لکھا اور ان سے سورج بابا کی موت کی تصدیق چاہی۔ جلد ہی ان کا جواب آ گیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ سورج بابا کا واقعی انتقال ہوگیا ہے۔ انتقال بستی میں ہوا اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ سورج بابا نے مرنے سے قبل یہ وصیت کی کہ اسے جلانے کے بجائے دفن کر دیا جائے اور کہاں دفن کیا جائے' یہ بھی بتا دیا۔ لہٰذا ان مزدوروں نے اس جگہ جہاں بابا کے چیتے کی کٹیا ہوا کرتی تھی' گڑھا کھود کر انہیں دفن کر دیا۔

آج چودہ سال بعد جو یہ پراسرار واقعات کسی فلم کی طرح میرے ذہن کے پروجیکٹر پر چلنے لگے ہیں اور میں خود کو ننک پور کے جنگلات میں گھومتا ہوا

محسوس کر رہا ہوں تو اس کی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ اصل میں وہ لڑکی ہے' جس کا انٹرویو لینے... میں اس کے گھر پہنچ گیا' وہ بینک آفیسر جو اس وقت کی مشہور گلوکارہ ہے' جس کا نام ندرت ہے۔

ندرت سے مجھے میرے ایک دوست آصف نے ملوایا تھا' جو بینک میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہے۔ اسی نے انٹرویو کا انتظام کیا تھا۔ ندرت کے ڈرائنگ روم میں' میں نے وہ تصویر دیکھی تھی' جس میں ایک برہنہ عورت کو ایک ریچھ نے اٹھایا ہوا تھا اور یہ تصویر خود ندرت کی بنائی ہوئی تھی۔ اس نے اس تصویر کے ساتھ اپنی ٹرانسپرنسی بنانے سے روک دیا تھا۔ وہ شادی شدہ تھی۔ اس کی ماں نے اسے کسی ریچھ کے ساتھ بیاہ دیا تھا اور وہ اپنی اس المناک شادی پر ایک لفظ سننا یا کہنا گوارا نہ کرتی تھی۔ میرے فوٹوگرافر نے اس لڑکی کے بارے میں کہا تھا' یہ لڑکی فراڈ ہے' خواہشوں کی ماری۔

ندرت سے انٹرویو کرنے کے بعد میں پورے دن خلجان میں مبتلا رہا تھا۔ رات کو بستر پر لیٹا تو ننک پور کا جنگل نگاہوں میں گھوم گیا اور ایک ایک واقعہ میری آنکھوں میں اترنے لگا۔ انہی واقعات کو دہراتے جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے جو خیال آیا وہ ندرت کا تھا۔ وہ میرے ذہن پر چپک کر رہ گئی تھی اور اس کی وجہ اس کی پراسرار شخصیت تھی۔ ایسے لوگ مجھے ہمیشہ سے اپیل کرتے ہیں۔ اب میرا ذہن مجھے اس بات پر راغب کر رہا تھا کہ میں کسی طرح ندرت کی زندگی کے ڈھکے گوشوں سے پردہ کھسکاؤں' لیکن کیسے؟

بظاہر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ ندرت ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس سے کچھ اگلوا لینا بے حد مشکل تھا۔ آخر ندرت میرے لیے چیلنج بن گئی اور میں نے اس کی شخصیت کے اسرار کھولنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

دفتر جا کر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کا انٹرویو لکھنے بیٹھ گیا۔

اس انٹرویو پر میں نے بڑی محنت کی۔ ایک ایک لفظ چمکایا۔ سطر سطر ہار پروئے۔ صفحہ صفحہ مہکایا۔ شام تک میں اسی انٹرویو میں لگا رہا۔ بالآخر کام اپنے انجام کو پہنچا۔

میں ابھی آصف کو ٹیلیفون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی کال آ گئی

''شام کو کیا پروگرام ہے؟''

آصف نے علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

''تنہا لوگوں کا کیا پروگرام ہوسکتا ہے یار؟''

میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''یار تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟'' ایسا وہ اکثر کہا کرتا تھا

''شادی بھی کوئی کرنے کی چیز ہے؟''

میں نے جواب دیا۔

''اچھا چلو عشق کرلو۔''

''عشق کوئی رس ملائی تو ہے نہیں کہ پلیٹ میں ڈالی اور لگے کھانے۔''

''اس کھانے پر یاد آیا کہ بہت دن سے ہم لوگوں نے کہیں بیٹھ کر کچھ کھایا پیا نہیں۔ آج کی شام کیوں نہ کسی ریستوران میں گزاری جائے۔ کچھ گپ شپ بھی رہے گی۔''

''ٹھیک ہے۔''

میں فوراً ہی راضی ہوگیا' کیونکہ میں خود بھی اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔

طے یہ ہوا کہ آصف مجھے دفتر سے اپنے ساتھ لے لے گا۔ پھر ہم لوگ کہیں جا کر بیٹھ جائیں گے۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہ میرے دفتر آ گیا اور ہم لوگ یہاں سے نکل کر ''گل رنگ'' جا بیٹھے۔

''میں نے وہ انٹرویو مکمل کرلیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ ایک اچھی چیز

بن گئی ہے۔ کل ٹرانسپیرنسیاں بھی مل جائیں گی۔ اب تم کہو تو اسی ہفتے اس کا انٹرویو لگا دوں؟''

آصف سے یہ جملے میں نے بہت سوچ سمجھ کر کہے۔

''فوراً لگا دو۔ یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ وہ صبح مجھ سے پوچھ بھی رہی تھی کہ انٹرویو آنے کی کب تک توقع ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی اخبارنویسوں سے ڈرتے ہی رہنا چاہیے۔ ان کی ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔ اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں یہ لوگ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انٹرویو کب تک آئے۔ ویسے اندازاً میں نے اس سے ایک ماہ کہہ دیا ہے۔ اسی ہفتے آ جائے تو وہ خوش ہوجائے گی۔ ویسے وہ تمہاری خاصی تعریف کررہی تھی۔'' آصف میری طرف سگریٹ کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''مثلاً اس نے کہا ہوگا کہ ایسے بے وقوف لوگ اس نے کم ہی دیکھیں ہیں۔'' میں نے پیکٹ سے ایک سگریٹ کھینچتے ہوئے کہا:

''وہ کہہ رہی تھی کہ بڑے عمدہ آدمی ہیں۔ دوسروں سے مختلف۔''

''یار آصف! اس کی شادی کا کیا حکم ہے۔ کل وہ بات ادھوری ہی رہ گئی تھی تم بتا رہے تھے کہ اس کی ماں نے کسی ریچھ سے اس کی شادی کردی تھی۔ کون شخص تھا وہ؟''

موقع دیکھ کر میں فوراً ہی اصل موضوع پر آ گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس کی شادی کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ خود سے اس نے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ میں نے بھی کبھی اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے اصل میں کسی کے ذاتی معاملات میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے کی عادت نہیں۔ ایک آدھ بار ہی اس سے اس موضوع پر بات ہوئی ہے۔ بس اس نے اتنا ہی بتایا کہ اس کا شوہر ایک برے کردار کا مالک تھا۔ انتہائی

سخت مزاج ریچھ جیسا' نباہ نہ ہوسکا اور وہ طلاق لے کر اپنے گھر آ گئی۔'' آصف نے بتایا۔

''تم بھی شریف آدمی ہی نکلے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس کے پیچھے پڑ جاتا۔ بتا' تجھ پر کیا گزری۔ تیرے شوہر نے تجھ پر ایسے کیا ظلم ڈھائے کہ اسے ریچھ صفت کہنے لگی۔''

''تو اور کیا۔'' میں نے کہا۔

میرا جواب سن کر آصف نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور میز پر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا:

''ایک بار میں نے کوشش کی تھی کہ اس المناک موضوع پر اس سے کچھ گلواؤں تو اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھے روک دیا تھا اور پھر چند لمحوں بعد مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ میرا تم سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

''ارے! بڑی عجیب بات کہی اس نے۔''

''بعض وقت وہ ایسی ہی بات کرتی ہے۔ کچھ کھسکی ہوئی ہے وہ... ''

آصف نے چائے میں چمچا گھماتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''کاہے کے بارے میں۔''

''ندرت کی شادی کے راز سے کیسے پردہ ہٹے۔''

''یہ یکا یک تمہیں اس سے اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی؟''

''اس سے نہیں' ان واقعات سے مجھے دلچسپی ہے' جن کے بارے میں وہ زبان نہیں کھولنا چاہتی۔''

''تم ایسا کرو' اس سے دوستی کرلو۔ ممکن ہے وہ تمہیں کچھ بتا دے۔''

''ضروری تو نہیں' تم بھی آخر اس کے دوست ہی ہو۔ اس کے بارے

میں آج تک دو جملوں سے زیادہ نہ جان سکے۔''

پھر بات آگے نہ بڑھ سکی۔ آگے بڑھتی بھی تو کیا ملتا۔ آصف کو اس کی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ طارق کے اچانک ہماری میز پر ٹوٹ پڑنے سے ندرت کا سلسلہ ہی منقطع ہوگیا۔ طارق ہم دونوں کا مشترکہ دوست تھا۔ میرے دفتر میں چپراسی سے اسے پتا چل گیا تھا کہ میں آصف کے ساتھ نکلا ہوں۔ پھر اس کا ہمیں ڈھونڈ نکالنا اتنا مشکل نہ تھا اور اب اس کی موجودگی میں کسی سنجیدہ موضوع پر بات کرنا محال تھا۔

ندرت کا انٹرویو میں نے اس کی کئی ٹرانسپیرنسیوں کے ساتھ نمایاں انداز میں اسی ہفتے شائع کردیا۔ اب میں آصف کے ٹیلی فون کا بے چینی سے منتظر تھا۔ میں اس کی زبانی اس انٹرویو کے بارے میں ندرت کی رائے سننا چاہتا تھا۔

دوپہر تک جب خلاف توقع اس کا ٹیلی فون نہ آیا' تو میں نے اسے رنگ کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ آج بینک آیا ہی نہیں۔ پھر سوچا ندرت سے براہ راست بات کروں' مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔

دوسرے دن جب میں دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ آصف کا کئی بار ٹیلی فون آچکا ہے میں نے فوراً ہی اس کا نمبر گھمایا۔

''ہاں بھئی آصف''

''یار! ایک بری خبر ہے۔''

''خیر تو ہے' کیا ہوا؟''

''ندرت ہسپتال میں ہے۔ اس نے خواب آور گولیاں کھالیں۔''

☆......☆......☆

''خودکشی؟'' نہیں معلوم کہ یہ سوال میں نے اپنے آپ سے کیا تھا یا آصف سے۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' آصف نے جواب دیا۔

''کیسی حالت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سے بہتر ہے۔ لیکن ابھی خطرے سے باہر نہیں'' اس نے بتایا۔

''یہ اچانک اسے کیا ہوا؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کل میں بینک آنے کے لیے تیار ہورہا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن ثروت پریشان حال گھر میں داخل ہوئی اور مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ خیر! اسے تسلیاں دے کر بٹھایا۔ تب اس نے بتایا کہ ندرت آپی نے بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں کھا لی ہیں۔ وہ تو بھلا ہو اس ڈاکٹر کا' جو ان کے پڑوس میں رہتا ہے کہ اس نے اپنی گاڑی میں ڈال کر ہسپتال پہنچادیا' ورنہ رات کے تین بجے اس کی چھوٹی بہن کے بس کا نہ تھا کہ وہ اسے ہسپتال لے جاتی۔ بہرحال قسمت کی خوبی سے اسے بروقت ایڈ مل گئی ہے۔ اب آگے اللہ مالک ہے۔''

''اب تم کب جاؤ گے' اس کے پاس؟''

''شام کو جاؤں گا''

''میں بھی جانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں تمہیں دفتر سے لےلوں گا۔'' یہ کہہ کر آصف نے ریسیور رکھ دیا۔

شام کو میں جلد ہی اپنے کام سے فارغ ہوگیا اور اب بڑی بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ نظر بار بار گھڑی پر جا ٹکتی تھی۔ آصف کا بینک میرے دفتر والی سڑک پر ہی تھا۔ اسے یہاں تک پہنچنے میں مشکل سے پانچ منٹ لگتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔

میں ندرت کے بارے میں دن بھر سوچتا رہا تھا۔ میں اس کے بارے میں اتنا تو جان گیا تھا کہ شادی کے المیہ نے اسے نفسیاتی عارضے میں مبتلا کردیا ہے۔ پھر وہ مجھے ایک غیر معمولی حساس لڑکی بھی دکھائی دی۔ لیکن مجھے اس سے ایسی امید نہیں تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایسی نادانی کی امید نہ تھی کہ ایسی پرآسائش زندگی جس میں عزت' دولت اور شہرت سب ہی کچھ تھا' یوں ٹھکرا دے گی۔

میں ابھی انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ آصف کی ''ہیلو'' نے چونکا دیا

''اتنی دیر کیوں کردی؟'' میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''یار! کام اتنا تھا کہ اٹھتے اٹھتے وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ ویسے فکر کی کوئی بات نہیں۔ ندرت کو ہوش آگیا ہے اب وہ خطرے سے باہر ہے ثروت سے ابھی آدھا گھنٹہ پہلے میری بات ہوئی ہے اب تم اٹھو۔ یہاں سے گھر چلتے ہیں۔ چائے وائے پی کر پھر ہسپتال چلیں گے بات اصل میں یہ ہے کہ میں آج تھک اتنا گیا ہوں کہ بغیر نہائے زندگی کا مزا نہیں آئے گا۔'' آصف گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے بولا۔

میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔ جب گاڑی سٹارٹ ہوئی تو میں نے آصف پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا ''اچانک ایسی کیا بات ہوئی کہ نوبت اقدام خودکشی تک پہنچی؟''

''میرے علم میں تو کوئی ایسی بات نہیں۔ پرسوں شام میں نے اسے ٹھیک ٹھاک گھر پر چھوڑا تھا۔ وہ معمول کے مطابق تھی۔ ہنستی' بولتی اور قہقہے لگاتی۔ ہاں' اس دن اس نے نیند نہ آنے کی شکایت ضرور کی تھی۔ لیکن وہ بھی غیر اہم انداز میں۔ نیند نہ آنے کا ذکر سن کر میں نے اسے مذاق میں شادی کرنے کا مشورہ دیا تھا' جس پر اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ کیا کروں تم شادی شدہ ہو' ورنہ تم ہی سے شادی کر لیتی۔ اب مجھ سے تو کوئی آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہی شادی کر سکتا ہے اچھا کل ملیں گے۔ یہ کہتی ہوئی وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی تھی یہ تھی آخری بات' جو اس نے مجھ سے کی تھی'

''کہیں' اس نے غلطی سے تو گولیاں نہیں کھا لیں؟''

''اب وہ ایسی نادان بھی نہیں۔''

''ویسے ایک بات ہے آصف' خودکشی کرنا اتنا آسان نہیں۔ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ خودکشی صرف وہی آدمی کرتا ہے' جس پر ہر طرف سے اندھیرا چھا گیا ہو۔ جو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گھر گیا ہو۔ جسے کوئی راستہ نہ سجھائی دیتا ہو۔ ندرت کی زندگی میں اچانک ایسا کیا واقعہ رونما ہوا کہ اس نے پوری شیشی حلق میں الٹ لی۔''

''یار! وہ بس عجیب ہی لڑکی ہے۔ پتا نہیں کیا کیا الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہے۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس پر کیا بیتی۔''

جب ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے' تو ندرت ہمیں دیکھ کر مسکرائی اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے فوراً ہی اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا اور اس سے پوچھا ''کہیے کیا حال ہے؟''

''بس آپ کی دعاؤں سے بچ گئی۔''

جی چاہا کہ فوراً سوال کروں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ پھر کچھ سوچ کر رک گیا کہ ابھی فوراً ہی ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے۔

''اور آصف جینک کا کیا حال ہے؟''

''جینک کی عمارت اپنی جگہ جوں کی توں کھڑی ہے۔'' آصف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میں نے اپنا انٹرویو دیکھ لیا تھا۔ آپ نے بڑی شان سے چھاپا ہے۔ میں ممنون ہوں آپ کی۔''

''آپ نے جتنی شان سے انٹرویو دیا تھا' اتنی ہی شان سے چھپ گیا' اس میں میرا کیا کارنامہ ہے۔''

''مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ اس میں کچھ الٹا سیدھا نہ لکھ دیں۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ وہی لکھا' جو میں نے کہا تھا۔''

''یہ ثروت کہاں ہے؟'' آصف نے اسے تنہا دیکھ کر پوچھا۔

''باہر گئی ہے' کچھ دوائیں وغیرہ لینے۔ کیوں؟ چائے پینی ہے کیا؟''

''نہیں بھئی! ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ نظر جو نہیں آئی۔''

''لو وہ آ گئی۔'' ندرت نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے دروازے میں ایک اٹھارہ' انیس سال کی لڑکی داخل ہوتی نظر آئی۔ اس نے ہم دونوں کو بڑے ادب سے سلام کیا اور دوائیں میز پر سجا کر خاموشی سے بنچ پر بیٹھ گئی۔ ثروت کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ کہیں سے بھی ندرت کی بہن نہ دکھائی دی۔ نہ رنگ' نہ روپ' نہ نقشہ' کچھ بھی تو نہ میل کھاتا تھا اس سے۔ ندرت اگر چاند تھی تو وہ چاند کا داغ۔

''ثروت ذرا مجھے اٹھا۔''

''اچھا آپی۔''

ثروت نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور آصف نے اس کی پیٹھ کے پیچھے دو تین تکیے کھڑے کر دیے۔ ندرت نے نیم دراز ہو کر تکیے پر سر ٹکا لیا۔ اور ہم دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی: ''آپ لوگ بیٹھ جائیں۔''

ہم دونوں ثروت کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گئے۔

''ثروت چائے بنا لے۔''

''اچھا آپی۔''

''ارے کیا ضرورت ہے اس تکلف کی؟''

''میں نے بھی تو نہیں پی نہ چائے' اس بہانے میں بھی پی لوں گی۔''

ثروت نے خاموشی سے کیتلی اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ ثروت کے جانے کے بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ندرت نے ایک دو بار ہماری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔

''ندرت تم نے کتنی گولیاں کھائی تھیں؟'' آصف نے غیر متوقع سوال کیا۔

''معلوم نہیں...... میں نے تو شیشی ہی انڈیل لی تھی منہ میں' ہاں ان میں چند ایک زمین پر بھی گری تھیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ جواب تو تم نے کچھ اس انداز میں دیا' جیسے خواب آور گولیاں نہ کھائی ہوں' ٹافیاں کھائی ہوں۔''

''پھر کیا رو کر جواب دیتی۔''

ندرت نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ اچانک اتنی گولیاں کھانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی' آپ کو۔'' میں نے موقع غنیمت جان کر اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا۔

جب سے میں ہوش میں آئی ہوں' یہ سوال مختلف لوگ مجھ سے دریافت کر چکے ہیں اور سب کو میں جواب دے چکی ہوں۔ لیکن میری بات پر یقین کوئی

نہیں کرتا۔ آپ کو بھی بتا دیتی ہوں۔ یقین کریں یا نہ کریں اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ بہرحال حقیقت یہی ہے کہ گولیاں میں نے غصے میں کھائی تھیں۔''

''غصے میں؟'' آصف نے سوال کیا۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ خواب آور گولیوں کی میں ہمیشہ سے عادی ہوں۔ گولی کھائے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔ کل ایسا ہوا کہ تین گولیاں کھانے کے باوجود مجھے نیند نہ آئی' تو مجھے غصہ آ گیا اور یوں میں نے پوری شیشی اپنے حلق میں اتار لی''

''واہ! کیا عقلمندی کا ثبوت دیا تم نے۔''

آصف نے مذاقاً کہا۔

ندرت کے لہجے میں بڑی سچائی تھی مجھے فوراً اس کے جواب پر یقین آ گیا۔ ویسے اس جواب نے اس کی شخصیت سے ایک پردہ اور ہٹا دیا تھا۔

ہم دونوں تقریباً دو گھنٹے تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ جب ہم چلنے لگے تو ندرت مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:

''آپ سے ایک درخواست کرنی ہے۔''

''جی فرمائیے؟''

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''یہ خبر پریس کے ہتھے نہ چڑھے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ یہ ہدایت اگر آپ مجھے نہ دیتیں' تو بھی یہ میرے سینے میں رہتی۔ مجھے لوگوں کو تکلیف پہنچانے کا بالکل شوق نہیں۔'' میرے اس جواب سے ندرت کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت چھا گئی۔ اس نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

دوسرے دن میں اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھا کہ آصف کا ٹیلی فون

آ پہنچا۔ وہ کہہ رہا تھا:

''ہاں بھئی! شام کو ندرت کی طرف چلو گے؟''

''اب کیا حال ہے اس کا؟''

''بہت بہتر ہے۔ ممکن ہے ایک آدھ دن میں اسے ہسپتال سے چھٹی مل جائے۔''

''آج شام کو مجھے ایک کام تھا۔ ایسا کرو' آج تم چلے جاؤ' پھر کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''کام وام کو گولی مارو' میرے ساتھ شام کو ہسپتال چلو' اس نے تمہیں بلایا ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے۔''

''نہیں' یہ جھوٹ نہیں۔ دن کے اجالے کی طرح سچ ہے۔''

''بلانے کی وجہ؟''

''وجہ نامعلوم۔''

''آخر تم سے کچھ کہا تو ہوگا؟''

''صرف اتنا کہ شام کو اکیلے نہ آنا' انہیں بھی ساتھ لانا۔''

''یہ پیغام ثروت نے تمہیں دیا؟''

''نہیں' خود ندرت نے ہسپتال سے مجھ سے بات کی تھی۔ کوئی اور سوال۔''

اب میں آصف سے کیا سوال کرتا۔ اس کی بات سن کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا۔

''تم بہت خوش قسمت ہو یار' ندرت تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔''

''یہ کیا مذاق ہے؟''

''میں ندرت کو برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ بہت کھری لڑکی ہے۔ دل کی

صاف۔ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتی' چاہے وہ دوسروں کی نظروں میں کتنا ہی خراب ہو۔ اس نے ریچھ اور عورت کی تصویر بنانا چاہی تو اپنے بیڈ روم میں لگا لیتی۔ باہر والوں کو اس کا علم بھی نہ ہوتا۔ لیکن تم نے دیکھا کہ وہ خطرناک تصویر اس نے اپنے ڈرائنگ روم میں لگا رکھی ہے۔ اسی طرح تم اسے اچھے لگے ہو' تو اس نے بلا جھجک مجھ سے کہہ دیا کہ شام کو تمہیں اپنے ساتھ لیتا آؤں اور یہ جو میں نے تمہیں خوش قسمت کہا تو اس کی بھی ایک وجہ ہے۔''

آصف اتنا کہہ کر جان بوجھ کر رک گیا۔

''جی' وہ بھی فرما دیں۔''

''ندرت بڑی بے نیاز سی لڑکی ہے' اپنی ذات میں مگن۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دوستوں کی تعداد ایک انگلی پر گنی جا سکتی ہے۔ اور اب اس فہرست میں تمہارا بھی اضافہ ہوگیا ہے اور میری پیش گوئی یہ ہے کہ تمہارا نام چند ہی روز میں سرفہرست ہو جائے گا۔''

اس دوستی کا اگر یہ فائدہ ہو کہ وہ مجھے اپنی شادی کے المیے کے بارے میں سب کچھ بتا دے' پھر تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں اس سے بھی زیادہ بے نیاز آدمی ہوں' اپنے کام سے کام رکھنے والا' اپنے دائرے میں گم۔''

''ممکن ہے' تم اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤ۔ بہر حال ابتدا بری نہیں۔''

''ٹھیک ہے' پھر میں شام کو تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''زندہ باد۔''

آصف نے ایک زوردار نعرہ لگایا اور پھر مجھے ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔

شام کو جب ہم ہسپتال پہنچے تو ندرت ہمیں باہر ہی مل گئی۔ وہ ثروت کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے دور ہی سے ہاتھ ہلایا۔

''کیا ہسپتال سے چھٹی ہوگئی تمہاری؟'' آصف نے نزدیک پہنچتے ہی

سوال کیا۔

''نہیں کمرے میں دل نہیں لگ رہا تھا' اس لیے یہاں آ کر بیٹھ گئی۔''

آصف نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا' میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور ندرت سے مخاطب ہو کر بولا:

''کہیے آج آپ کا کیا حال رہا؟''

''بالکل ٹھیک ہوں۔ کل شاید یہاں سے چھٹی مل جائے۔ مجھے تو یہ ہسپتال قبروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی۔ ڈرے' ڈرے سہمے سہمے چہرے منکر نکیروں کی طرح سوال کرتے ڈاکٹر کفن کھینچتا ہوا عملہ۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ بس ابھی یہاں سے بھاگ جاؤں۔ کیا کروں مجبوری ہے۔ کل تک کسی نہ کسی طرح وقت کاٹنا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ اپنی لمبی انگلیاں چٹخانے لگی۔

''آپی میں ابھی آتی ہوں۔'' ثروت یہ کہہ کر اٹھی تو مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ چائے لانے گئی ہے۔

''آپ کون سا سگریٹ پیتے ہیں؟'' یہ سوال مجھ سے تھا اور اچانک۔

''میں کوئی سگریٹ نہیں پیتا۔''

''سگریٹ پیتے ہی نہیں' چلو چھٹی ہوئی۔''

''تم نے سگریٹ پینی ہے؟''

آصف نے اس سے پوچھا۔

''ہاں'' ندرت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ عورتوں کی سگریٹ نوشی کے خلاف تو نہیں؟''

''آپ سگریٹ پیتی ہیں۔'' میرے لیے یہ بات باعث حیرت تھی۔

''جی ہاں! لیکن دو تین سگریٹ سے زائد نہیں۔''

''کیا ڈاکٹر کو یہ بات معلوم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں! اس شریف آدمی نے سختی سے سگریٹ پینے کو منع کیا ہے۔ اس لیے میں کمرے سے اٹھ کر یہاں آ گئی ہوں۔ آصف نکالو سگریٹ۔''

یہ ٹھیک ہے کہ میں سگریٹ پینے کا عادی نہ تھا' لیکن آصف کے ساتھ یہ ''عیاشی'' کبھی کبھار کر لیا کرتا تھا۔ جب ندرت نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا' تو اس کے ساتھ ہی میں نے بھی ایک سگریٹ کھینچ لیا ندرت نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔ اس نے آصف سے ماچس لے کر سب سے پہلے میرا سگریٹ سلگایا۔ پھر آصف کا اور اس کے بعد اپنا۔ وہ بڑی مہارت سے سگریٹ پی رہی تھی' کش لیتی' دھواں اندر اتارتی اور چند لمحوں بعد اس کی ناک کے نتھنوں سے دھواں خارج ہونے لگتا۔

میں انتہائی بھونڈے پن سے سگریٹ پی رہا تھا۔ کش لیتا اور فوراً منہ کھول کر دھواں باہر نکال دیتا۔ ندرت مجھے بڑی دلچسپی سے سگریٹ کے ساتھ مذاق کرتا دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ثروت چائے کی ٹرے اٹھائے آ گئی۔ اس نے بڑے سلیقے سے چائے بنا کر پیش کی۔ اتنی دیر میں ان دونوں بہنوں کی صورتوں کا تقابل کرتا رہا۔ لیکن باوجود کوشش کے کوئی مماثلت تلاش نہ کر سکا۔

''آپ کو اس ہسپتال میں کسی نے پہچانا نہیں؟''

''آپ جب میرا انٹرویو لینے میرے گھر تشریف لائے تھے' تو آپ نے مجھے پہچانا تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''اس لیے کہ میں آپ کو غیر متوقع طور پر اول جلول صورت میں نظر آئی تھی۔''

''شاید یہی بات تھی۔''

''پھر ہسپتال میں آنے والے لوگ مجھے کیسے پہچانیں گے۔ انہیں اس بات کی کہاں توقع ہوگی کہ گلوکارہ ندرت اس ہسپتال کے ایک کمرے میں موجود ہے۔ ویسے میں نے احتیاط برتی ہے۔ دن بھر میرے کمرے کا دروازہ بند رہتا ہے۔ یہاں میں چادر لپیٹ کر آئی تھی۔''

''لیکن ہسپتال کا عملہ تو آپ کو دیکھتا ہوگا؟''

''کسی ڈاکٹر نے تو مجھے نہیں پہچانا۔ شاید یہ لوگ اپنی مصروفیت کی وجہ سے ٹی وی دیکھتے ہی نہیں۔ البتہ ایک نرس نے مجھے ضرور پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ میرا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی کہ آپ گلوکارہ ندرت ہیں۔ میں نے بڑی ہی معصومیت سے انکار میں گردن ہلا دی اور کہا کہ نہیں میں بینک آفیسر ندرت ہوں۔ یہ سن کر اس کا اپنا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا اور وہ فوراً ہی کمرے سے نکل بھاگی۔ ثروت کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس نے اس نرس کے سامنے کھی کھی نہ کی' ورنہ بھانڈا پھوٹ جاتا۔''

ندرت نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگا لیا اور ناک سے دھواں نکالتے ہوئے گویا ہوئی:

''اب آپ اس بات پر غور کریں۔ میں یہاں بیٹھی ہوں سامنے ہی سڑک ہے۔ کتنے لوگ یہاں سے گزر رہے ہیں۔ لیکن کوئی مجھے نہیں پہچان رہا۔ یہ دور اصل میں نفسانفسی کا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ ہم اپنے ہی دائروں میں گھومتے' فریب نظر میں مبتلا زندگی گزارتے چلے آرہے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ یہ دنیا اللہ میاں نے کیوں بنائی؟''

''ہم انسانوں کے لیے کہ ہم اس دنیا میں رہ کر اس کی بخشی ہوئی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں۔ سیدھے راستے پر چلیں اور اس واحد خدا کی عبادت کریں'

جس نے ہمیں اتنا کچھ بخشا۔'' میں نے سیدھے سادے الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''لیکن میرا خیال اس سے ذرا مختلف ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ دنیا بطور کھلونا بنائی گئی ہے اور دنیا کی ہر شے جس میں انسان بھی شامل ہیں' کھلونوں کی طرح ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ جانے والے' ایک نادیدہ ہاتھ ہم سب کو چابیاں دیتا رہتا ہے اور ہم اپنی چابیاں ختم ہونے تک چلتے رہتے ہیں۔''

پھر بات تخلیق کائنات سے ہوتی ہوئی انسانی نفسیات پر پہنچی۔ ہمارا عمل' ردعمل' ہمارے مختلف رویے میں خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنتا رہا۔

اس شام مجھے اندازہ ہوا کہ ندرت عام سی لڑکی نہیں' وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔ شوہر سے نباہ نہ ہونے کی وجہ اس کا ذہین ہونا بھی ہوسکتا ہے۔ پتا نہیں اس کا شوہر کیسا تھا۔ کہیں اس کی ذہانت سے احساس کمتری میں تو نہیں مبتلا ہوگیا۔

دوسرے دن ہسپتال سے ندرت کو چھٹی ہوگئی۔ ڈاکٹر نے پندرہ روز تک مکمل آرام کرنے کی ہدایت کی۔ لیکن ندرت آرام کرنے کے موڈ میں بالکل نہ تھی۔ اور اس کی وجہ تنہائی تھی۔ ثروت کے کالج جانے کے بعد وہ گھر میں اکیلی رہ جاتی اور یہ اکیلا پن اسے سکون پہنچانے کے بجائے اذیت میں مبتلا کر دیتا۔ جب میں نے اسے آرام کرنے کی تلقین کی' تو الٹے روزے گلے پڑ گئے۔ وہ اس شرط پر آرام کرنے کے لیے راضی ہوئی کہ میں روز شام کو اس کے گھر آؤں اور وہاں سے رات کا کھانا کھا کر نکلوں۔ اس طرح وہ دن کی اذیت ناک تنہائی شام کی ملاقات کے آسرے پر برداشت کرلے گی۔ تنہا ہونے کی وجہ سے شامیں میری بھی خالی تھیں۔ یہ وقت میں آصف یا کسی اور دوست کے ساتھ آوارہ گردی میں گزارتا تھا۔ میں نے سوچا اگر میری وجہ سے کسی کو سکھ پہنچتا ہے' تو پہنچا دیا جائے۔ ویسے بھی اس سے قریب ہونے کا یہ بہترین موقع تھا۔

شروع کے دو تین دن تو آصف میرے ساتھ ندرت کے گھر جاتا رہا۔ پھر بہن کی شادی میں مصروف ہوجانے کی وجہ سے مجھے تنہا ہی ندرت کے ہاں جانا پڑا۔

ندرت اور میرے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوئی جارہی تھی۔ وہ آصف کی پرانی دوست تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اچانک خیال آیا کہ یہ جو آصف نے میرے ساتھ اس کے گھر جانا چھوڑ دیا ہے' اس کے پیچھے کہیں کوئی جلن تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں فوراً ہی ندرت سے ملاقات بند کردوں گا۔

اس خیال نے اس قدر شدت اختیار کی کہ مجھے آصف سے ٹیلیفون پر بات کرتے ہی بنی۔ میں نے صاف صاف انداز میں اس سے بات کی۔ میری بات سن کر آصف نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا:

''یار! تم بہت بھولے ہو۔ ندرت میری دوست ہے' محبوبہ نہیں۔ اگر محبوبہ ہوتی تو شاید میں برا مانتا۔ تم اس کے حلقۂ دوستی میں آگئے ہو' تو یہ بات میرے لیے باعث تکلیف نہیں' باعث راحت ہے۔''

آصف کے اس جواب نے مجھے سکون کا سانس لینے پر مجبور کردیا۔ میں خواہ مخواہ خود کو مجرم تصور کرنے لگا تھا۔

ندرت کے پاس جاتے ہوئے مجھے سات روز ہوگئے تھے۔ ان سات دنوں میں ہم نے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر شادی کے موضوع کو نہیں چھیڑا تھا۔ اب مجھے کچھ کچھ امید ہونے لگی تھی کہ میں اس اکیلے سے پردہ اٹھوا سکوں گا۔

میں اس کی باتیں بڑے سکون اور توجہ سے سنتا تھا اور اس کی ان باتوں سے مجھے اس کے بارے میں اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی تھی۔ ہر شام ایک نئی ندرت سے میری ملاقات ہوتی تھی۔

ایک دن یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ یافتہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ مجھے سنایا۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نئی نئی سٹیج پر آئی تھی اور میں نے ابھی دو چار ہی پرفارمنس دی تھیں اور میں مقبول ہونا شروع ہوگئی تھی۔ ایسی ابھرتی گلوکارہ کو ایک رات اس شہر کے ایک کروڑ پتی شخص نے اسے گھر تک پہنچانے کی آفر کی۔ میں نے یہ پیشکش بلاجھجک قبول کرلی۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ میں ان کے بغیر کہے ان کی گاڑی میں اگلی سیٹ پر ان کے برابر بیٹھ گئی' ان کی پیشکش کو بلاجھجک قبول کرنے اور اپنی مرضی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ جانے اور میرے تنہا ہونے نے شاید ان کو غلط فہمی میں مبتلا کردیا اور انہوں نے اپنے عزائم میں یقینی کامیابی ہوتے محسوس کی۔ سڑک سنسان تھی۔ ابھی ہم آدھے راستے میں تھے کہ گیئر بدلتے ان کا ہاتھ ذرا سا بہکا۔ میں نے فوراً ہی ان سے گاڑی روکنے کی درخواست کی۔ انہوں نے فوراً ہی گاڑی روک لی اور میرے عزائم کا قطعاً اندازہ نہ کرپائے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ان کا ہاتھ پکڑا' ان کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک بار پھر انہوں نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ دوسرے لمحے ان کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور ان کا ہاتھ کندھے سے اتر گیا۔ میں غصے سے بھری گاڑی سے اتری' اس وقت میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ گھر کیسے جاؤں گی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک ٹیکسی وہاں سے گزری۔ میں نے ہاتھ دے کر اسے روکا۔ بڑی بڑی مونچھوں والے ڈرائیور نے مجھے اوپر سے نیچے تک گھور کر دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ کہاں جانا ہے۔ میں نے اسے اپنا پتا بتایا وہ چلنے کے لیے فوراً ہی راضی ہوگیا۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے میں رک گئی۔ اس خیال سے کہ یہ ٹیکسی والا مجھے ایسی ویسی نہ سمجھ لے۔ میں نے ذرا فاصلے پر کھڑی گاڑی اور اس میں بے ہوش پڑے آدمی کا ذکر کردیا۔ اس ذکر نے ٹیکسی ڈرائیور کے ہوش اڑا دیئے۔ اپنے دل

میں اگر وہ برے خیال لایا بھی ہوگا' تو وہ بلبلے کی طرح بیٹھ گیا اور اس طرح ایک تنہا لڑکی کو رات کے ایک بجے اس ٹیکسی ڈرائیور نے بحفاظت اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ کہیے ہے نا حیرت کی بات؟''

''خیر بات تو حیرت کی ہے۔ لیکن وہ صاحب تھے کون؟''

''یہ نہ پوچھیں۔ مجھ سے اپنا ہاتھ تڑوا کر بعد میں وہ بہت پشیمان ہوئے۔ مجھ سے ٹیلیفون پر معافی مانگی اور اب خیر سے حج کرنے گئے ہیں۔ میں نے اسی وقت ان کا نام راز میں رکھنے کا عہد کرلیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ میرا عہد توڑنے پر مجھے مجبور نہیں کریں گے۔''

میں نے اسے اس کا عہد توڑنے پر مجبور نہ کیا اور خود ہی دل میں اندازہ لگاتا رہا کہ وہ کون شخص ہوسکتا ہے۔ لیکن اندازہ نہ لگا پایا اس لیے کہ اس شہر میں کروڑپتیوں کی تعداد محدود تو نہیں۔ ناجائز کاروبار کے اس دور میں' جس پر نظر ڈالو وہی کروڑپتی نکل آتا ہے۔

''ڈرائنگ روم میں لگی اس ریچھ اور عورت کی تصویر پر جب بھی میری نظر پڑتی تو جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ فوراً ہی اپنے فوٹوگرافر ارشاد بھائی کا جملہ دماغ میں ہتھوڑے برسانے لگتا۔ خدا کی قسم! یہ لڑکی خواہشوں کی ماری ہے۔ انتہائی غیرمعمولی خواہشوں کی دلدادہ۔ ایک دم فراڈ۔''

لیکن میرے مشاہدے میں اب تک کوئی ایسی بات نہ آئی' جس سے اس کا غیرمعمولی ہونا ثابت ہوتا۔ جنس کے مسئلے پر۔

ایک دن آصف نے اس کے بارے میں جو بات بتائی اس سے بھی اس کا خواہشوں کی ماری ہونا معلوم نہ ہوا۔ وہ اگر خواہشوں کی ماری ہوتی تو وہ سب کرگزرتی' جس کی اسے ترغیب دی گئی تھی۔

آصف نے غالباً یہ واقعہ مجھے پیش بندی کے طور پر سنایا تھا کہ میں اپنے

بڑھتے ہوئے تعلقات کو ایک حد میں رکھوں۔ یہ بات میں نے گرہ سے باندھ لی تھی۔ ویسے بھی مجھے حدود توڑنے کی عادت نہیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے' جب ندرت سے میرے تعلقات بہت گہرے تھے۔ اتنے گہرے کہ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھے بنا چین نہیں آتا تھا۔ اگرچہ وہ میرے بینک میں ہی تھی' اس کے باوجود وہ دن میں ایک دوبار میری سیٹ پر ضرور آتی اور اسی طرح میں بھی اس کی سیٹ پر ایک دو بار ہو آتا۔ بینک سے ہم ایک ساتھ ہی نکلتے اور گھروں کا رخ کرنے کے بجائے ادھر ادھر گھوما کرتے۔ رات کو میں اسے اس کے گھر چھوڑتا اور پھر میں اپنے گھر کا رخ کرتا اور اپنی بیوی کو دیر سے آنے کے مختلف بہانے کردیتا۔ ندرت خودمختار تھی' اسے پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ اس طرح ہمارا شام کا وقت سمندر کے کنارے' ہوٹلوں اور پارکوں اور سینماؤں میں گزر رہا تھا۔ ندرت یہ جاننے کے باوجود کہ میں شادی شدہ ہوں اور اپنی بیوی سے مطمئن' وہ دن بہ دن مجھ سے کلوز ہوتی جارہی تھی۔ میں بھی اس کے حسن کی رعنائیوں میں گم ہونے لگا تھا۔ ایک رات جب ہم کوئی انگریزی فلم دیکھ کر گھر لوٹے' تو اس کے گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن پڑوس میں گھر کی چابی دے کر خالہ کے یہاں چلی گئی تھی۔ میں اسے تنہا دیکھ کر رک گیا اور اس نے بھی کوئی تردد نہ کیا۔ اس رات اس نے مجھے ڈھیر سارے گانے سنائے' پرلطف باتیں کیں اور ہم دیر تک تاش کے پتوں میں الجھے رہے۔ جب میں حد سے تجاوز کرنے لگا تو ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہوگئی اور بڑے سرد لہجے میں بولی کہ اس طرح کی منزلیں طوائف پار کرتی ہے یا بیوی۔ تم جانتے ہو کہ میں طوائف ہوں اور نہ تمہاری بیوی۔ یہ سب کچھ کرنا ہے تو اپنی بیوی کو طلاق دو اور مجھ سے شادی کرلو۔ اس کے اس جواب نے مجھے پسینے میں شرابور کردیا اور اس دن کے بعد ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔ ہمارے درمیان سے جنس غائب ہوگئی۔''

یہ واقعہ اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ ندرت بڑے ٹھوس کردار کی مالک ہے۔ خواہ غموں کی ماری ہوتی' تو جذبات کے ریلے میں کہاں کی کہاں پہنچتی۔

ایک شام حسب معمول میں اس کے گھر پر موجود تھا۔ ہم بڑی خاموشی سے شطرنج کھیل رہے تھے کہ اس نے مہرہ چلنے سے پہلے سر اٹھایا' مجھے چمکتی نگاہوں سے دیکھا اور غیر متوقع انداز میں بولی:

''آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ ایک لمحے کو میں خالی الذہن ہو گیا۔ مجھے فوراً ہی کوئی جواب نہ سوجھا میں نے خانوں میں رکھے مہروں کو بغور دیکھا۔ اس کی متوقع چال اور غیر متوقع سوال کا جائزہ لیا اور پھر بڑے یقین سے بولا:

''جی ہاں! میں نے محبت کی ہے۔ لیکن آخر میں' میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیاوی تمام محبتوں میں سب سے افضل خدا کی محبت ہے۔ باقی تمام محبتوں میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔ جبکہ خدا سے محبت کرنے میں کہیں سے بھی کوئی نقصان نہیں۔''

مجھے پوری توقع تھی کہ میرے اس ناصحانہ جواب پر وہ لاحول پڑھے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ میری حسرت من ہی میں رہی۔ میرے اس جواب نے اسے سوچ میں مبتلا کر دیا اور پھر اس نے دھیرے سے ایک خطرناک چال چلتے ہوئے کہا:

''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

ندرت اس وقت' اس شہر کی مقبول گلوکارہ تھی۔ موسیقی کا کوئی پروگرام اس کے بغیر سونا سونا لگتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اتنی مقبولیت کے باوجود اس نے آج تک کسی پرفارمنس کا ایک پیسہ بھی نہ لیا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو ہزاروں روپے ایک پروگرام کے وصول کر سکتی تھی۔

''آپ پروگرام کرنے کے پیسے کیوں نہیں لیتیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں پروفیشنل نہیں ہوں۔ میں شوقیہ گاتی ہوں۔ جب میرا جی چاہے گا' گانا چھوڑ دوں گی۔''

''گانا تو آپ پیسے وصول کر کے بھی چھوڑ سکتی ہیں۔ آپ کو کون روک سکتا ہے؟''

''روکے گا تو خیر کوئی نہیں' لیکن معاوضہ لے کر گانے سے وابستگی بڑھ جاتی ہے۔ پھر یہ میرا شوق نہ رہے گا۔ پیشہ بن جائے گا اور پیشہ میں اسے بنانا نہیں چاہتی۔ معاوضہ نہ لینے کا ایک اور فائدہ ہے کہ میں اپنی مرضی سے دس پروگراموں میں سے ایک پروگرام منتخب کرتی ہوں اور اس ادارے کا سربراہ مجھے گھر سے لے کر جاتا اور واپس گھر چھوڑتا ہے۔ پروگرام کے دوران بھی میرا خاصا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک بات اور بتاؤں آپ کو' مجھے پیسے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ بینک سے مجھے اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ میرا اور میری بہن کا خرچ بہت آسانی سے چل جاتا ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے' پیسے کے پیچھے دوڑنے کی۔''

ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہم لوگ شطرنج کھیلنے کے بعد چائے پینے میں مصروف تھے کہ ندرت نے اپنی پیالی بڑی عجلت میں میز پر رکھی اور اپنے پاؤں سمیٹ کر صوفے پر رکھے اور گٹھڑی بن کر تھرتھر کانپنے لگی۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔

میں ابھی یہ اندازہ کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ یہ کس قسم کا دورہ ہے کہ دروازے پر ثروت نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سینڈل تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے بولی' ''آپی کہاں ہے؟''

☆ ... ☆ ... ☆

''وہ' وہ'' ندرت نے بدستور کانپتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔

ثروت ہاتھ میں سینڈل پکڑے اس طرف بڑھی۔ اس نے بڑی تیزی سے ادھر ادھر کچھ تلاش کیا اور پھر مجھے سینڈل پٹ پٹ مارنے کی آوازیں سنائی دیں۔

''آپی' مار دیا'' ثروت نے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا۔

یہ سنتے ہی ندرت ایک دم نارمل ہوگئی اور مجھے شرمندہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی:

''معاف کیجیے گا۔''

جب ثروت اپنے سینڈل کے تلے پر اپنے شکار کو رکھے میرے سامنے سے گزری تو مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

''آپ اس سے ڈر گئی تھیں۔'' میں نے حیرت ظاہر کی۔

''جی یہ آپی لال بیگ سے بہت ڈرتی ہیں۔''

''یہ کمبخت مجھے نظر بھی فوراً ہی آجاتے ہیں۔''

''لال بیگ تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے ڈرا جائے۔''

''پتا نہیں' کیوں مجھے اس سے اس قدر ڈر لگتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور جب تک اسے مار نہ دیا جائے' مجھے سکون نہیں ملتا۔ بھلا ہو ثروت کا کہ وہ اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے کہیں نہ کہیں سے اسے ڈھونڈ نکالتی ہے اور مار کر ہی دم لیتی ہے۔''

''اس خوف کے پیچھے کوئی واقعہ ہے؟''

''نہیں کوئی واقعہ نہیں۔ آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر میں لال بیگ سے ڈر گئی' تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں کوئی بزدل قسم کی لڑکی ہوں۔ میں سانپ سے بالکل نہیں ڈرتی۔ اگر سانپ اس وقت میرے سامنے آجائے' تو میں اسی طرح آرام سے بیٹھی رہوں گی۔''

''حیرت ہے کہ لال بیگ سے ڈرتی ہیں' لیکن سانپ سے نہیں ڈرتیں۔ اور ریچھ کے بارے میں کیا خیال ہے' آپ کا۔ اگر کوئی ریچھ اچانک اس ڈرائنگ روم میں نمودار ہو جائے' تو کیا کریں گی آپ؟''

''ریچھ سے تو مجھے قطعاً ڈر نہیں لگتا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ......''

''آپ نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''تصویر بنانا تو خیر ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ریچھ کو اپنے ہاتھ سے گھاس کھلا چکی ہوں۔''

''یہ آپ زندہ ریچھ کی بات کر رہی ہیں نا؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''جی ہاں! کسی مجسمے کی بات نہیں کر رہی' زندہ ریچھ کی بات کر رہی ہوں۔ یہاں ایک ریچھ والا کبھی کبھی آتا ہے۔ اس کے پاس ریچھ کا جوڑا ہے۔ وہ جب بھی اس علاقے میں آتا ہے' تو میرے گھر سے ہو کر ضرور جاتا ہے۔ میں اس سے ریچھ کا تماشا دیکھتی ہوں۔ اب تو وہ ریچھ مجھ سے خاصا مانوس ہو گیا ہے۔ میں پڑوس سے خرگوشوں والی نرم نرم گھاس منگوا لیتی ہوں۔ میرے برابر والے گھر میں خرگوش پلے ہوئے ہیں' کبھی اس کی سبزی اور پھلوں سے تواضع کرتی ہوں۔ میں نے اس کے لیے فارن کا شہد لا کر رکھا ہوا ہے۔ میں شہد اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ آگے کر دیتی ہوں' وہ اپنی لمبی زبان سے بڑے مزے سے شہد چاٹتا ہے۔''

''یہ خاطریں صرف ریچھ کی ہوتی ہیں یا ریچھنی کی بھی؟''

''صرف ریچھ کی۔'' ندرت نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ایک دوبار میں نے ریچھنی کو بھی کھلانے کی کوشش کی' لیکن اس نے نہیں کھایا۔ وہ صرف مداری کے ہی ہاتھ سے کھاتی ہے۔ شاید مجھ سے جلتی ہے وہ۔''

''یہ آپ کو ریچھ سے اتنا لگاؤ کیوں ہے؟''

''اصل میں' میں بچپن سے ہی تمام جانوروں میں ریچھ کو پسند کرتی ہوں۔ جب میں بہت چھوٹی سی تھی' چار پانچ سال کی' اس وقت سے ہی ریچھ کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتی تھی۔ محلے میں جب بھی ریچھ والا آتا' تو میں کسی نہ کسی طرح تماشا دیکھنے پہنچ جاتی اور بڑی دلچسپی سے اس کی دلچسپ حرکتیں دیکھتی۔ ایک بار میں اپنے ابو کی انگلی پکڑے تماشا دیکھ رہی تھی کہ میں نے ریچھ کی پیٹھ پر بیٹھنے کی ضد کی۔ ابو نے فوراً ہی مجھے اس کی پیٹھ پر سوار کردیا۔ میں بے انتہا خوش ہوئی۔ اس کے لمبے لمبے بال پکڑ کر کھینچتی رہی۔ گھر آ کر جب امی کو معلوم ہوا کہ میں ریچھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر آئی ہوں' تو انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیا۔ جب ذرا ان کی طبیعت سنبھلی تو بے چارے ابو کی شامت آ گئی۔ اس کے علاوہ ہم جب بھی چڑیا گھر جاتے' تو میری توجہ کا مرکز ہمیشہ ریچھ کا پنجرہ ہوتا۔ میں دیر تک ریچھوں کو تکا کرتی۔''

''آپ کی پسند کچھ عجیب سی نہیں ہے؟''

''کیوں؟''

''ریچھ مجھے تو بڑا بدہیئت جانور دکھائی دیتا ہے۔ بالوں کا تودہ ذرا بھی تو حسن نہیں اس میں۔ مجھے تو اس کے روئیں روئیں میں اسرار چھپے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ عورت اور ریچھ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔'' میں نے اسے چھیڑا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونک پڑی۔

''دونوں ہی پراسرار ہوتے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''خیر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ عورتیں تو کھلی کتاب کی طرح ہوتی ہیں۔''

''یہ محض کتابی جملہ ہے۔ ورنہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ عورتیں مرد کے مقابلے میں زیادہ گہری ہوتی ہیں۔ اندر ہی اندر مرد کا سمجھنا آسان ہوتا ہے' عورت کا سمجھنا مشکل۔ بعض وقت عورت خوش ہوتی ہے تو اس کی آنکھ میں آنسو ہوتے ہیں اور ہنس رہی ہوتی ہے' تو ضروری نہیں کہ خوش ہے۔ کبھی اس کی ''ہاں'' ''نہیں'' ہوتی ہے اور کبھی اس کی ''نہیں'' ''ہاں۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' احتجاج ہوا۔

''جھوٹ کیوں ہے؟'' پوچھا گیا۔

''اصل میں آپ نے عورت کو دیکھا نہیں۔ آپ ایسا کریں شادی کرلیں۔''

''اگر میں نے شادی نہیں کی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں عورت سے ناواقف ہوں۔'' میں نے بڑے یقین سے کہا۔

''اچھا'' اس نے اچھا کو ایک خاص انداز سے کھینچا۔

''آپ کی اس اچھا نے تو میرے جملے کا مفہوم ہی تبدیل کردیا۔ اب میں اس قدر بھی عورت سے واقف نہیں ہوں۔''

''جو لوگ عورت کو پہیلی' معمہ یا ناسمجھ میں آنے والی چیز سمجھتے ہیں' وہ دراصل خود بیوقوف ہوتے ہیں۔''

''یہ مان لیتا ہوں میں۔'' میں نے بڑی فراخدلی سے کہا۔

''لیکن آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔''

''عقلمندی کے اس سرٹیفکیٹ کا بہت بہت شکریہ۔

ندرت کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ ایک آدھ دن ہی باقی تھا۔ میں

بڑی پابندی سے اس کے ہاں آرہا تھا اور ان تیرہ چودہ دنوں میں۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ اس کی شخصیت کے بے حس پہلو میرے سامنے آگئے تھے۔ لیکن اصل پہلو سات پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ شادی سے متعلق بھی کوئی بات میں نہ جان سکا تھا۔ میں نے ابھی تک اس موضوع کو نہیں چھیڑا تھا' نہ ہی ندرت کی طرف سے پہل ہوئی تھی۔ میں بڑے صبر سے اس وقت کا منتظر تھا' اس لمحے کا منتظر تھا کہ میں شادی کا ذکر چھیڑوں تو خودبخود اسرار کے پردے اٹھتے چلے جائیں۔

ندرت کی چھٹیاں ختم ہوئیں' تو اس نے مزید پندرہ دن کی چھٹیاں اور بڑھا لیں۔ طبی نقطۂ نظر سے وہ بالکل صحت یاب تھی۔ ڈاکٹر نے بینک جوائن کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن اس نے خلاف توقع چھٹیوں میں اضافہ کر دیا۔

ادھر بینک میں ندرت کی مزید چھٹی کی درخواست پہنچی' ادھر آصف کا ٹیلی فون آیا۔

''کیوں بھئی' یہ کیا چکر ہے؟'' میں نے ریسیور اٹھا کر ''ہیلو'' کہا تو ادھر سے سوال ہوا۔ میں تو فوراً ہی سمجھ گیا کہ روئے سخن کس طرف ہے۔ لیکن انجان بن گیا۔

''کیسا چکر؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''ندرت نے چھٹیاں کیوں بڑھالیں؟''

''تم نے آنا جانا جو چھوڑ دیا' اس لیے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تم دونوں یہ بات جانتے ہو کہ میں آج کل کس قدر مصروف ہوں۔ ذرا بہن کی شادی ہو جائے' پھر یہ شکایت نہ ہوگی۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ اس نے چھٹی کیوں بڑھالی۔ کیا ڈاکٹر نے مزید آرام کو کہا ہے؟''

''نہیں' ڈاکٹر نے تو اسے بھلا چنگا ہونے کا تصدیق نامہ جاری کر دیا ہے۔ لیکن وہ خود کو شاید ابھی تک بیمار ہی سمجھتی ہے۔''

''یار! تم نے تو اسے بیمار نہیں کر دیا؟'' آصف کے لہجے میں شرارت تھی۔

''اصل میں' اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ چھڑے آدمی کو ہر شخص پولیس کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ میں چھڑا ضرور ہوں لیکن تمہارا دوست بھی تو ہوں۔ دوستوں کو تو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا ٹھیک نہیں۔''

''یار! مجھے ڈر ہی رہتا ہے۔''

''کیسا ڈر؟''

''کہیں تم سنجیدہ نہ ہو جاؤ۔''

''میرے سنجیدہ ہونے سے تمہیں دکھ پہنچے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! بہت زیادہ' اس لیے نہیں کہ تم میری دوست کو مجھ سے چھین لو گے۔ بلکہ اس لیے کہ میں ندرت کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ خوش نہ رہ سکو گے۔ وہ نفسیاتی مریضہ ہے' تمہیں کچھ نہ دے سکے گی' سوائے اذیتوں کے۔'' آصف نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''تم فکر نہ کرو' میرا اس سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میری دلچسپی اس کے کردار کے مطالعے تک ہے۔''

آصف کے ٹیلیفون کے بعد میں اپنے دل کے گوشوں کو ٹٹولنے بیٹھ گیا۔ ندرت میں میری دلچسپی کردار کے مطالعے تک ہی تھی۔ اس بات کی گواہی میرے دل نے دی تو' مجھے اطمینان سا ہوا۔

شام کو حسب معمول جب میں ندرت کے یہاں پہنچا' تو ندرت کو ڈرائنگ روم میں ایک سوٹ پوش مرد کے پاس بیٹھا پایا۔ دروازے میں گھستے ہی میں نے جو منظر دیکھا' وہ کچھ اس طرح تھا کہ وہ سوٹ پوش صاحب نوٹوں کی موٹی سی گڈی

ندرت کی طرف بڑھا رہے ہیں اور وہ ان نوٹوں کو قبول کرنے سے انکار کر رہی
ہے۔

مجھے دروازے میں پا کر ان صاحب نے نوٹوں کی گڈی فوراً اپنی طرف
کر لی اور ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ندرت نے مجھے دیکھ کر حسب معمول ''آیئے
آیئے'' کا نعرہ لگایا اور احتراماً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ندرت کو کھڑا ہوتے دیکھ کر وہ صاحب بھی میرے عوامی سوٹ پر نظر
ڈالتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ ایک اجنبی شخص کو خواہ
مخواہ میری وجہ سے اٹھنا پڑا۔ میں نے فوراً ہی انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ندرت نے میرا تعارف کرا دیا۔ لیکن اس شخص کے بارے میں مجھے کچھ نہ
بتایا۔

''صاحب! آپ ہی کچھ سفارش کر دیجئے؟'' وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا۔

''کیسی سفارش؟''

''مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھے بغیر کل ہونے والے
موسیقی کے پروگرام میں ان کا نام دے دیا۔ پبلسٹی ہو چکی ہے۔ ٹکٹ فروخت
ہو چکے ہیں اور یہ پروگرام میں جانے کے لیے تیار نہیں۔ اگر یہ پروگرام میں شامل
نہ ہوئیں' تو میری عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔''

اب مجھے اس آدمی کی اصل معلوم ہوئی۔ میں نے ندرت کی طرف سوالیہ
نگاہوں سے دیکھا۔

''میں نے پروگرام میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نے فیصلہ
کیا ہے کہ اب آئندہ کسی پروگرام میں حصہ نہیں لوں گی۔'' ندرت نے بتایا۔

''میں بے موت مارا جاؤں گا' ندرت صاحبہ میں اس پرفارمنس کے دس
ہزار روپے دینے کو تیار ہوں۔ فی الحال یہ سات ہزار رکھ لیجئے' تین ہزار میں

پروگرام ختم ہوتے ہی پیش کر دوں گا۔ اب تو انکار نہ کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے
نوٹوں کی گڈی ندرت کے سامنے میز پر رکھ دی۔

''اچھا' ٹھیک ہے۔ آپ ایسے نہیں مانیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے نوٹوں
کی گڈی اٹھائی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس
نے بڑی بے دردی سے نوٹوں کی گڈی دروازے کی طرف اچھال دی اور انتہائی
غصے سے بولی: ''جب میں نے آپ سے ایک بار کہہ دیا کہ میں نے گانا چھوڑ دیا
ہے اب میں کسی پروگرام میں حصہ نہیں لوں گی' تو یہ آپ مجھے روپوں کا لالچ کیا
دے رہے ہیں۔ مجھے بھی آپ نے کسی کوٹھے کی گانے والی سمجھا ہے۔ آپ کے
پیسے وہ دروازے کے باہر پڑے ہیں۔ اب آپ بھی یہاں سے دفع ہو جائیں۔''
اتنا کہہ کر ندرت کانپتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

اس شخص کی حالت دیکھنے والی تھی۔ مجھے اس پر بڑا رحم آیا۔ لیکن معاملہ
میرے بس سے باہر تھا۔ میں ندرت کی ضدی طبیعت سے واقف تھا۔ اب اسے
دنیا کا کوئی شخص گانے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

وہ شخص ڈگمگاتے قدموں سے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ چند لمحوں بعد
میں نے دروازے پر گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

گاڑی کی آواز جب دور چلی گئی' تو ندرت اندرونی دروازے سے مسکراتی
ہوئی برآمد ہوئی۔ ''گیا کمبخت؟''

''ہاں' کمبخت تو گیا لیکن یہ آپ نے اچانک کیا فیصلہ کر لیا؟''

''اب سٹیج پر کبھی نہیں جاؤں گی۔'' ندرت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ریڈیو اور ٹی وی پر بھی نہیں؟''

''نہیں' نہیں' نہیں۔''

''اس فیصلے کی کوئی خاص وجہ۔''

''نہیں' کچھ نہیں۔ بس جی نہیں چاہتا۔''

''آپ تو کمال کی خاتون ہیں۔ اس قدر جذباتی فیصلہ۔ ایسے عروج کے زمانے میں کہ ایک پرفارمنس کے دس ہزار روپے مل جائیں' عزت اور شہرت مفت ہاتھ آئے' آپ نے نہ گانے کا فیصلہ کرلیا۔ آپ واقعی بڑے دل گردے کی مالک ہیں۔''

''ارے چھوڑیں' اب اس ذکر کو۔ بتائیں کیا پئیں گے۔ چائے یا کافی؟''

''جو پلا دیں۔''

''چاہے زہر ہی کیوں نہ ہو؟'' ندرت نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ زہر پلاسکتی ہیں مجھے؟''

''نہیں' میں کسی کو کیا زہر پلاؤں گی' میں تو آج تک خود ہی زہر پیتی رہی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی کہانی لکھوں لیکن لکھ نہیں سکتی' الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ یہ کام آپ کیوں نہیں کرتے؟''

اس کی یہ بات سن کر میں خوشی سے اچھل پڑا' یہ تو آپ ہی صیاد اپنے دام میں آ گیا۔ مجھے اس کی قطعاً امید نہ تھی کہ وہ اپنی کہانی کی خود ہی پیشکش کردے گی۔ میں تو صبر کیے بیٹھا تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔ بالآخر صبر کا پھل میٹھا ثابت ہوا۔

میں نے اپنی خوشی کو فوراً دبا لیا۔ اس لیے کہ ندرت کی کھوپڑی ذرا الٹی تھی۔ اگر اسے یہ معلوم ہوجاتا کہ میں تو خود اس کی کہانی خاص کر شادی کا المیہ جاننے کے لیے بے قرار ہوں' تو ممکن تھا کہ وہ چپ سادھ لیتی۔ آصف کے ساتھ یہی تو ہوا تھا' اس کے اصرار پر وہ معاملے کو خوبصورتی سے ٹال گئی تھی۔

''میں تو سیدھا سادہ صحافی ہوں' مجھے کہانی لکھنا تو نہیں آتا۔ یہ کام تو کوئی

افسانہ نگار ہی کرسکتا ہے۔''

''نہیں یہ کام آپ بہت اچھی طرح کرسکتے ہیں' مجھے یقین ہے۔''

''آپ کے پاس کوئی کہانی ہے کیا؟''

''میری پوری زندگی کہانی ہے۔ میں چار پانچ سال کی تھی' تب ہی سے کہانی کا کردار بن گئی تھی۔ آج تک خاموشی سے دل پر پتھر رکھے اس کردار کو نبھاتی آرہی ہوں۔ کبھی کبھی تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ لوگوں کو چیخ چیخ کر اپنا حال سناؤں۔ لیکن پھر رک جاتی ہوں۔ یہ سوچ کر کہ یہ دنیا نفسانفسی کے عالم میں مبتلا ہے۔ یہاں کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ دوسرے کے دل میں جھانکے۔ اگر کوئی کسی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو صرف تفریح کے لیے' کسی کا دکھ بانٹنے کے لیے نہیں۔ آصف آپ کا دوست ہے۔ میری بھی اس سے خاصی پرانی دوستی ہے' لیکن وہ میرے ماضی کے بارے میں دو جملوں سے زیادہ نہ جان سکا اور ان دو جملوں میں بھی سچ نہ تھا۔''

''کیوں آخر؟''

''آصف محض بینکر ہے' حسابی کتابی آدمی' وہ انسانی نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا میں نے بھینس کے آگے بین بجانا مناسب نہ سمجھا۔ میرے دکھ صرف وہی سمجھ سکتا ہے' جو دردمند دل رکھتا ہو۔ کئی روز سے میرے دل میں ایک خواہش ابھر رہی ہے کہ آپ کے سامنے اپنے سارے دکھ رکھ دوں' اپنی کڑوی کہانی بیان کردوں' اپنی المناک داستان کہہ سناؤں۔ شاید اس طرح میرا تزکیہ نفس ہوجائے'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''آپ اپنے دل کا حال کہہ سنایئے۔ میں پوری توجہ سے سنوں گا۔''

''میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں۔ آیئے شطرنج کھیلیں۔''

اور پھر وہ شطرنج کھیلنے ایسی بیٹھی کہ اسے یاد بھی نہ رہا کہ وہ مجھے اپنی کہانی

سنانے والی ہے۔ میں نے بھی اسے نہ چھیڑا اور نہ ہی کچھ یاد دلایا۔

ہم لوگوں کو کافی دیر کھیلتے ہوئے ہوگئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس بازی کے ختم ہوتے ہی یہاں سے نکل لوں گا کہ اچانک اس نے میرا گھوڑا مارتے ہوئے' ایک غیرمتوقع بات کہہ دی۔

''کئی سال سے میں کسی پہاڑی مقام پر نہیں گئی۔ اس صنعتی شہر میں تو کبھی کبھی دم گھٹنے لگتا ہے' کیوں نہ ہم کہیں چلیں۔ کسی پرسکون جگہ پہنچ کر میں آپ کو سکون سے اپنے بارے میں بتاؤں گی۔ مقام کا انتخاب آپ خود کرلیں' رہی اخراجات کی بات' تو اس کی ذمہ داری میری۔'' اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''اخراجات کی تو خیر کوئی بات نہیں' اصل مسئلہ چھٹی کا ہے۔ دفتر سے لمبی چھٹی ملنا مشکل ہے۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

لمبی چھٹی کی کیا ضرورت ہے' صرف چار دن کی چھٹی لے لیجئے۔ ہوائی جہاز سے چلیں گے اور اس پہاڑی مقام پر جس کا تعین ہونا باقی ہے' صرف دو دن رہیں گے۔'' ندرت نے پہلے ہی سارا پروگرام مرتب کرلیا تھا۔

چند لمحوں کو میں چکرا کر رہ گیا۔ سوچنے لگا یہ ندرت مجھ سے کیا چاہتی ہے آخر اس کے ذہن میں کیا ہے؟ اپنی کہانی سنانے کے لیے کسی پہاڑی مقام پر جانا کیا ضروری ہے؟ وہ اپنی آپ بیتی تو مجھے اس گھر میں بھی سنا سکتی ہے۔ اس گھر میں اس کی بہن کے سوا کون ہے۔ ہر طرف سکون ہی سکون ہے۔

ندرت سے میں نے انکار کیا نہ اقرار ''اچھا سوچیں گے۔'' کہہ کر اسے ٹال دیا۔ دوسرے دن جب میں نے آصف سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ پھڑک اٹھا۔

''یار! کچھ مت سوچو' آنکھیں بند کر کے ندرت کی پیشکش قبول کرلو۔ ایسی آفریں بار بار نہیں ملا کرتیں۔ اگر یہ آفر مجھے ندرت نے دی ہوتی تو میں دفتر میں

بیٹھنے کے بجائے جہاز میں بیٹھا ہوتا۔''

''تمہارے خیال میں اس پیشکش کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے کریدا۔

''مطلب صاف اور واضح ہے اسے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔''

''پھر وہ آپ بیتی سنانے کا شاخسانہ محض ڈرامہ ہے تنہائی حاصل کرنے کا ذریعہ؟''

''میں تو یہ سمجھتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تم شاید اس کا جواب بھول گئے۔ وہ جواب جو اس نے تمہیں حد سے گزرنے پر دیا تھا کہ میں نہ طوائف ہوں اور نہ تمہاری بیوی۔''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ تمہیں بھی وہی جواب ملے' جو مجھے ملا تھا۔ ہر شخص کا اپنا اپنا تجربہ ہوتا ہے' اپنا اپنا تاثر ہوتا ہے۔''

''خیر! کچھ بھی ہو میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ میں اس کے ساتھ باہر نہیں جاؤں گا۔'' میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''منو کے چغد جو ٹھہرے۔'' آصف نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں نے خاموشی اختیار کی۔

دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔ ندرت نے نہ تو اس موضوع کو چھیڑا اور نہ ہی میں نے کوئی بات کی۔ میرے ضبط نے بالآخر اسے بولنے پر مجبور کردیا۔

''میں نے آپ سے کچھ عرض کیا تھا۔''

''فی الحال دفتر سے ایک دن کی چھٹی بھی ملنی مشکل ہے۔'' میں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

''آپ نے میری پیشکش کا غلط مطلب نکال لیا ہے شاید۔'' اس نے اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میں یہی جواب دے سکتا تھا۔

''چلئے لعنت بھیجئے اس پیشکش پر... مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اصل میں یہ بھول گئی تھی کہ سب سے پہلے آپ مرد ہیں' پھر کچھ اور۔''

میں نے لاکھ تاویلیں دیں' حقائق اور دلائل سے اسے سمجھانا چاہا' حیلے بہانوں سے اس کا دل بہلانا چاہا' لیکن بات نہ بنی۔ اس دن کے بعد اس نے اس موضوع پر خاموشی اختیار کرلی' چپ سادھ لی۔ میں اس خاموشی سے آنے والے طوفان کا اندازہ کرنے لگا' لیکن تماشا نہ ہوا۔

ایک دن کھانا کھا کر ثروت نے برتن سمیٹے اور چائے بنانے کے لیے کچن میں گئی تو ندرت نے کہا۔ ''آپ نے ایک دن ثروت کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا یہ آپ کی سگی بہن ہے؟ اور میں نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ لیکن آج آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ثروت میری سگی بہن نہیں۔''

''اچھا... !!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''وہ میری سوتیلی بہن ہے۔ میرے والد نے دو شادیاں کی تھیں اور یہ ثروت دوسری ماں کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنی ماں کو' خدا انہیں جنت نصیب کرے' بیمار ہی پایا۔ ان کا زیادہ تر وقت چارپائی پر ہی گزرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے چھوٹی عمر ہی سے گھر کے کام کاج میں لگ جانا پڑا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ میرے والد مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب وہ مجھے گھر کا کام کاج کرتے دیکھتے' تو بہت کڑھتے تھے۔ میں ابھی اتنی چھوٹی تھی کہ چائے وائے ہی بنا سکتی تھی۔ میرے والد دفتر سے آ کر ہنڈیا روٹی میں لگ جاتے تو میری ماں انہیں تشکر سے دیکھتی اور اپنی بیماری کو کوسنے لگتی۔ میرے والد انہیں تسلی دیتے کہ تم بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گی۔ میں اپنی ماں کے ٹھیک ہونے کی ہروقت دعائیں مانگا کرتی' جو کبھی قبول نہ ہوئیں۔ میرے والد انکم ٹیکس کے محکمے میں کلرک تھے۔ اگر چاہتے تو ہمارے گھر میں دولت کی ریل پیل

ہوسکتی تھی۔ لیکن انہوں نے کبھی ایسا نہ چاہا۔ ہمیشہ رزق حلال پر قناعت کی اور یہ جو آپ میرے اندر روپے پیسے سے بے نیازی دیکھتے ہیں' یہ انہی کی تربیت کا نتیجہ ہے میرے والد بہت خوب صورت آدمی تھے۔ ان کا باطن بھی بہت خوبصورت تھا۔ وہ بڑے نیک اور شریف انسان تھے۔ برا ہو اس عورت کا خدا اسے جہنم نصیب کرے' جس نے میرے والد کو گھیر لیا۔ وہ عورت بعد میں میری دوسری ماں بنی۔ وہ ایک گھٹیا عورت تھی۔ ڈائنوں جیسی شکل وصورت' معلوم نہیں میرے والد کو اس میں کیا نظر آیا کہ انہوں نے اسے گلے کا ہار بنالیا۔ میری ماں کہتی تھیں یہ عورت ٹونے ٹوٹکے والی ہے۔ اس نے تیرے والد کی مت پھیر دی ہے۔''

''آپ کی دوسری ماں کا آپ کے گھر آنا جانا تھا کیا؟''

''نہیں... نکاح سے پہلے اس نے ہمارے گھر کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ بلکہ نکاح کے کئی ماہ بعد وہ ہمارے گھر میں داخل ہوئی۔''

''پھر وہ عورت انہیں کہاں ملی؟'' میں نے سوال کیا۔

''ٹرین میں۔''

''ذرا تفصیل بتائیں؟''

''تفصیل یہ ہے جناب کہ میرے والد اپنے بھائی سے ملنے ایک بار لاہور گئے۔ یہ محترمہ انہی کے ڈبے میں براجمان تھیں اور تنہا تھیں۔ وہ عورت بڑی شیریں زبان تھی' وہ اس انداز سے بات کرتی تھی کہ آدمی سب کچھ بھول بھال کر اس کا ہوجاتا تھا۔ پتا نہیں اس سفر میں اس نے میرے والد سے کیا باتیں کیں کہ وہ اس کے لفظوں کے جال میں آگئے اور ایسے جال میں آئے کہ اپنے بھائی کے گھر جانے کے بجائے اس کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔ جب وہ لاہور سے پلٹے تو وہ ایک مختلف آدمی تھے۔ یہ بات میں نے بھی محسوس کی اور میری ماں نے بھی۔

اسی دن میری ماں نے مجھے گلے سے لگا کر روتے ہوئے کہا کہ ندرت ضرور کوئی گڑبڑ ہے اور گڑبڑ واقعی تھی' یہ گڑبڑ کئی ماہ بعد اس ڈائن کی صورت میں ہمارے گھر پر نازل ہوئی۔ میری ماں نے اسے دیکھ کر اپنے دل پر صبر کا پتھر رکھ لیا چپ سادھ لی۔ آنکھوں سے آنسو بھی نہ نکلنے دیے۔ جب مجھے بتایا گیا کہ یہ تمہاری دوسری ماں ہے' تو میں نے اس ڈائن کو ماں ماننے سے انکار کر دیا۔

میں نے کہا کہ میری ماں ہی میرے لیے بہت ہے' میرے اس احتجاج کو اس نے مسکراہٹ کے ساتھ سنا اور مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کی۔ اس ڈائن کے ساتھ ثروت بھی تھی۔ سہمی سہمی' ڈری ڈری۔ مجھے اسے دیکھ کر بہت رحم آیا۔ میں نے فوراً ہی اس کے لیے اپنی بانہیں فراخ کر دیں۔ جب وہ میرے قریب آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماں سے شدید نفرت کرتی ہے۔ یہ قدر مشترک اسے اور بھی مجھ سے قریب کر گئی۔ اس ڈائن کے گھر میں داخل ہوتے ہی ہمارے گھر کے شام وسحر تبدیل ہو گئے۔ گھر میں ہر وقت ہنگامہ سا رہنے لگا۔ میری ماں پہلے ہی کیا کم مریضہ تھیں کہ سوت کے غم نے تو ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ وہ لیٹے لیٹے گھر کے در و دیوار کو خالی خالی نگاہوں سے گھورا کرتیں' جیسے انہیں کوئی غم نہیں۔ میرے والد کا اب زیادہ تر وقت نئی بیگم کے ساتھ ہی گزرتا۔ گھر کے کام کاج اور ہنڈیا روٹی کا اب کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہ کام اب میں اور ثروت مل کر کرتے اور وہ دن بھر پلنگ توڑتی۔ شام ہوتی تو بن سنور کر دروازے پر جا کھڑی ہوتی۔ اسی طرح کی ڈرامہ بازیوں سے اس نے میرے والد کا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔ ایسی حرکتیں وہ جان جان کر میری ماں کے سامنے کیا کرتی۔ آج مجھے خیال آتا ہے تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اس وقت میری ماں کے دل پر کیا گزری ہوگی' اس کا اندازہ کرنا اتنا مشکل نہیں۔ میری ماں نے صرف چھ ماہ بعد ہی تمام دکھوں سے نجات حاصل کر لی۔ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں اور میں بے آسرا

ہوگئی۔''

''آپی جانا نہیں ہے کیا؟''

ثروت نے اچانک اندر آ کر کہا۔ جب میں نے اس پر نظر ڈالی تو وہ مجھے بال سنوارتی نظر آئی۔

''ارے! تم تو تیار بھی ہو گئیں۔''

''کیا بجا ہے اس وقت؟''

''پونے نو۔'' میں نے گھڑی دیکھی۔

''پہنچتے پہنچتے ساڑھے نو بج جائیں گے۔ آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔''

''بھئی کیا مسئلہ ہے' کہاں جانا ہے اس وقت؟''

مجھے اس وقت ثروت کی مداخلت بہت بری لگی۔ خدا خدا کر کے ندرت کچھ بتانے کے موڈ میں آئی تھی کہ اس نے کہیں آنے جانے کا چکر چلا دیا۔

''میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔ آج میں اور ثروت دوپہر کو صدر گئے تھے' تو واپسی پر میں نے کیپری والی فلم کی بکنگ کروا لی تھی اور آپ سے اجازت لیے بغیر آپ کا ٹکٹ بھی لے لیا تھا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''

یہ کہہ کر ندرت نے مجھے جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔'' مجھے فلم دیکھنے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا بھلا۔

''بہت شکریہ۔ میں بس چند منٹ میں تیار ہو جاتی ہوں۔ آپ بھی بال وال ٹھیک کرنا چاہیں تو اندر آ جائیں۔'' یہ کہہ کر ندرت تیزی سے اندر چلی گئی۔

ٹیکسی کے لیے ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ جیسے ہی سڑک پر آئے سامنے سے ایک ٹیکسی گزری اور ہاتھ دینے پر رک گئی۔

میں نے پچھلا دروازہ کھول کر ان دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے ثروت نے پاؤں ٹیکسی میں رکھا' پھر ندرت بیٹھی۔ اس طرح کہ مجھے اپنے بیٹھنے کی جگہ بھی

دکھائی دی۔ ندرت نے میری طرف ایک لمحہ کو دیکھا اس ساری کیفیت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا' جب میں پچھلا دروازہ بند کر کے اگلا دروازہ کھول چکا تھا۔ اب واپس پلٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ میں تیزی سے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ایک جھٹکے سے روانہ ہوگئی۔

جب ہم ہال میں پہنچے تو فلم کے ٹائٹل شروع ہو چکے تھے۔ گرتے پڑتے جلدی جلدی اپنی سیٹیں سنبھالیں۔ اس لیے کہ اس فلم کا شروع کا حصہ بہت اہم تھا۔ اس فلم کی میں نے شہرت سنی تھی' میں پورے انہماک سے فلم دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔ فلم کا سٹارٹ واقعی بہت اچھا تھا

فلم دیکھتے دیکھتے اچانک میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے بائیں جانب مڑ کر دیکھا

''ارے'' میں حیران رہ گیا۔ ندرت کی نگاہیں سکرین کے بجائے مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر سٹپٹا گئی۔ اس نے فوراً اپنا رخ سکرین کی طرف کرلیا۔

میں الجھ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس اندھیرے میں میرے چہرے پر کیا تلاش کررہی تھی سوچا پوچھوں لیکن کچھ سوچ کر رک گیا اور اپنی توجہ سکرین پر مرکوز کردی۔

تھوڑی دیر بعد پھر وہی احساس جاگا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ نظریں پلٹائیں تو ندرت کو پھر اپنی طرف متوجہ پایا۔

''کیا بات ہے فلم اچھی نہیں لگ رہی آپ کو؟''

میں نے پوچھا۔

''آپ کو کیسی لگ رہی ہے؟''

''مجھے تو بہت اچھی لگ رہی ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر آپ دیکھیں۔''

اس نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔

ادھر پردے پر فلم نے ایک نئی کروٹ لی۔ میں فلم دیکھنے میں پھر سے منہمک ہوگیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں نے ندرت کو بڑی بے چینی سے سیٹ پر پہلو بدلتے دیکھا۔ جیسے کوئی اسے کاٹ رہی ہو۔ پھر اس نے اچانک مجھے چونکا دیا۔

☆ ☆ ☆

''ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاتھوں کی حرکت جاری رکھی۔ تب میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے کہ وہ بڑی بے قراری سے اپنے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر پھیر رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' ندرت نے بہ مشکل جواب دیا۔

اس کے ہاتھ برف کی طرح ہو رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ کی پشت کو رگڑا۔ اس نے بڑی نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور انہیں پھر سے گلے پر پھیرنے لگی۔ اتنے میں ثروت بھی متوجہ ہوگئی۔ وہ بڑی تشویش سے بولی:

''آپی کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟''

''ثروت تم ایسا کرو کہ میں گھر چلتی ہوں، مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا تم ان کے ساتھ فلم دیکھ کر آجانا۔'' ندرت نے بدستور گلا دباتے ہوئے کہا۔

''آپی! میں تو اکیلا آپ کو نہیں جانے دوں گی۔'' ثروت نے بے قرار ہو کر کہا۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔'' ظاہر ہے میں ان دونوں کو تنہا کس طرح جانے دیتا۔ میں بلا تامل اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

ثروت نے ندرت کو سنبھال لیا۔ میں انہیں پیچھے چھوڑ کر ہال سے باہر نکل

آیا کہ ان کے باہر آنے تک کسی ٹیکسی کو پکڑ سکوں۔

گھر آ کر ثروت نے اسے بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں دبانے لگی۔ میں بیڈ کے قریب پڑے سٹول پر بیٹھ گیا۔

''مجھے ذرا ایک سگریٹ سلگا دیں۔'' ندرت نے سر اٹھا کر مجھ سے کہا۔

''اچھا۔'' میں نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے منہ میں لیے بغیر ماچس کی تیلی سے سلگایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

ندرت نے دو تین گہرے گہرے کش لیے۔

''پڑوس سے ڈاکٹر کو بلا لوں؟'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' اس نے بلاتردد کہا۔ ''میں تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ویسے بھی ڈاکٹر ابھی گھر پر نہ ہوگا۔ وہ بارہ بجے کے بعد آتا ہے۔''

ثروت کے ہاتھ پاؤں دبانے اور سگریٹ نوشی نے اس کی حالت کو بہتر کر دیا۔ اب وہ بڑی حد تک پرسکون انداز میں لیٹی تھی۔

''آپی، چائے بناؤں؟'' ثروت نے اس کی حالت بہتر دیکھ کر پوچھا۔

''فوراً بناؤ۔'' ندرت نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جب وہ کمرے سے نکل گئی تو ندرت مجھ سے مخاطب ہو کر بولی ''بڑی پیاری لڑکی ہے یہ۔ کس قدر خیال رکھتی ہے میرا۔''

''یہ دم گھٹنے کی شکایت کیا اس سے پہلے بھی کبھی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، کبھی کبھی۔ سال دو سال میں مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی قبر میں بند ہوں۔''

چائے وائے پینے کے بعد جب ندرت کی طبیعت مکمل طور پر بحال ہوگئی تو میں نے جانے کی اجازت چاہی۔

''اب اتنی رات گئے' گھر جا کر کیا کریں گے۔ یہیں سو جائیں۔'' ندرت نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

''اتنی رات تو نہیں ہوئی صرف ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ کراچی میں تو بڑی مشکل سے رات ہوتی ہے۔ چلا جاتا ہوں۔ آپ لوگوں کو خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔''

''تکلف چھوڑیں۔ اس تنہا گھر میں بھی آپ نے جا کر سونا ہی ہے۔ یہیں سو جائیں۔ کیا فرق پڑے گا۔ آپ کو۔ کیوں ثروت ٹھیک کہہ رہی ہوں نہ میں؟'' ندرت نے ثروت سے گواہی لی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' ثروت نے ہاں میں ہاں ملائی۔

اس کے بعد ان دونوں کا اس قدر اصرار بڑھا کہ مجھے وہاں ٹھہرتے ہی بنی۔

وہ رات میری آنکھوں میں کٹی۔ ندرت نے مجھے سونے نہ دیا۔ اور اچھا ہی ہوا جو میں نہ سویا' ورنہ جو سویا' اس نے کھویا والی بات ہو جاتی۔ میں نے اس رات جاگ کر بہت کچھ پایا۔ وہ رات حاصل دوتی ثابت ہوئی۔

ثروت کے اصرار پر پہلے تو ہم لوگوں نے لوڈو کھیلا۔ اس کے بعد رمی جمائی۔ رمی کھیلتے کھیلتے ثروت کو جمائیاں آنے لگیں۔

آپی' اب مجھے تو آ رہی ہے نیند۔'' ثروت نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے' تم سو جاؤ۔''

''چائے وغیرہ کی تو ضرورت نہیں؟''

''نہیں' ضرورت ہوگی تو میں خود بنالوں گی۔''

''اچھا آپی شب بخیر۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ثروت کے جانے کے بعد کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اپنی انگلیاں چٹخاتی رہی اور میں تاش کی گڈی ہاتھ میں لیے اسے پھینٹتا رہا۔

کچھ دیر کے بعد ندرت بیڈ سے اٹھی۔ کھڑے ہو کر اس نے ہلکی سی انگڑائی لی اور پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''دروازہ بند کر دوں' ڈریں گے تو نہیں؟''

''نہیں' میں تو نہیں ڈروں گا۔ دروازہ بند ہوتے دیکھ کر کہیں ثروت نہ ڈر جائے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں ثروت بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ وہ میری تمام عادتوں سے اچھی طرح واقف ہے۔'' ندرت نے بڑی لاپروائی سے کہا اور میرا جواب سنے بغیر ہی کھڑاک سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر مسکراتی ہوئی پلٹی اور بولی ''جوتوں کے بند کھول لیجئے۔ ۔آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ جایئے۔ آج کی رات میں آپ کو سونے نہیں دوں گی۔''

یہ جملہ میرے سر پر ہتھوڑے کی طرح پڑا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''کیا ارادے ہیں؟''

''کیا ارادے ہو سکتے ہیں؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا

''میں آپ کے بارے میں آج تک کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ اگر غلطی سے کوئی رائے قائم کر بھی لیتا ہوں تو وہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہتی۔ آپ قدم قدم پر حیران کرتی ہیں اور میں آپ کا صرف منہ دیکھتا رہ جاتا ہوں۔'' میں نے بڑی صفائی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

میری بات سن کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی۔ یہاں تک کہ میں اس کی ہذیانی ہنسی سے عاجز آ گیا۔

اچانک اس نے ہنستے ہنستے سر اٹھایا اور اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے

ہوئے بولی ''میرے لیے دل میں کوئی برا خیال مت لائیے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کرانے کی ماہر ہوں۔''

اس کے اس جواب سے مجھے ذہنی جھٹکا محسوس ہوا۔ اس مرتبہ میں پھر اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ یاالٰہی! یہ کیا چیز ہے؟ کہیں اندر کے گوشے سے آواز آئی۔

''میں آپ کو ایک کیسٹ سنواتی ہوں۔ یہ دروازہ میں نے اسی لیے بند کیا ہے کہ اس کی آواز ثروت کے کانوں تک نہ جائے۔ میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی۔'' یہ کہہ کر اس نے الماری کھولی اور اس کے سیف سے ایک کیسٹ نکالا۔

میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ میں نے کوئی سوال نہ کیا۔

''یہ ایک خفیہ کیسٹ ہے، اسے ذرا صبر وتحمل سے سنئے گا۔'' یہ بات اس نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہی۔

''جی بہتر!'' میں نے کہا۔ میں اس کیسٹ کے بارے میں قطعاً اندازہ نہ کر پایا کہ اس میں کیا بھرا ہوا ہے۔ اس کے خفیہ کہنے سے مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ کیسٹ شہر کے کسی بڑے آدمی سے متعلق ہے۔ کوئی ایسی گفتگو جسے ندرت ٹیپ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ دروازہ بند نہ کرتی۔ دروازہ اس نے اس لیے بند کیا تھا کہ اس کیسٹ کی آواز ثروت تک نہ پہنچے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا تعلق ثروت سے ہے۔

ٹیپ آن ہوا تو ایک عورت کی آواز ابھری۔ اس کے بعد ایک مرد کی آواز سنائی دی۔ دونوں کے درمیان بازاری گفتگو جاری تھی تیسرے درجے کے رومانی مکالمے دوہرائے جارہے تھے۔ ٹیپ سنتے سنتے میں نے یونہی ندرت کے چہرے پر نگاہ کی تو میں نے اس کے چہرے پر غصے کے اثرات نمایاں ہوتے دیکھے۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

کیسٹ دھیمی آواز میں بج رہا تھا۔ اب دونوں کی گفتگو انتہائی لچر انداز

اختیار کر گئی تھی۔ ایسی باتیں ہو رہی تھیں، جنہیں نہ قلم لکھ سکتا ہے اور نہ ہی میں اپنی زبان سے ادا کرسکتا ہوں۔

''بند کریں اسے۔'' میرے لیے اب یہ ٹیپ ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔

ندرت نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے صبر کرنے کا اشارہ کیا۔ لہٰذا میں پھر سے کیسٹ سننے لگا ان دونوں کی گفتگو تمام اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ چکی تھی۔ لفظ عریاں ہوگئے تھے۔ ان کی فحش گفتگو سنتے ہوئے میرا ذہن بھٹک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ندرت مجھے یہ اخلاق سوز ٹیپ کیوں سنوا رہی ہے ثروت کا اس ٹیپ سے کیا تعلق ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی مجھے اس ٹیپ کا کوئی واسطہ ندرت سے دکھائی دے رہا تھا۔ پھر ندرت اس ٹیپ کو سنوا کر مجھ سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔

ابھی میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک مرد نے ندرت کا نام لیا۔ میں چونک پڑا وہ کہہ رہا تھا:

''اگر اس حالت میں ندرت ہمیں دیکھ لے تو؟''

''ارے کس احمق کا نام لے لیا اس کا ذکر کر کے فضا نہ خراب کرو'' عورت کی آواز سنائی دی۔

تب ہی ندرت نے آگے بڑھ کر ٹیپ بند کردیا اور بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میرے لیے یہ انتہائی سنگین صورت حال تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اپنا ردعمل کس طرح ظاہر کروں۔ میں اسے کن لفظوں میں تسلی دوں۔ میں اس سے کیا کہوں۔

دو تین منٹ تک میں نے اسے رونے دیا کہ دل کا غبار کچھ ہلکا ہوجائے۔

پھر میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا:

''ندرت مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔ یہ کون لوگ ہیں؟''

ندرت نے میری بات سن کر فوراً آنسو پونچھ لیے اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھا اور سگریٹ ہونٹوں میں دبا لیا۔ پھر میں نے جلتی ہوئی تیلی اس کے سامنے کی۔ ندرت نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور اپنی کمر کے پیچھے دو تکیے رکھ کر نیم دراز ہوگئی۔

وہ کچھ دیر یوں ہی چھت کو گھورتی رہی۔ پھر دروازے کی طرف نظر ڈالتے ہوئے بولی ''کھول دیں اب دروازہ۔''

میں نے خاموشی سے اٹھ کر دروزہ کھول دیا اور پھر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

ندرت نے دھیرے دھیرے بڑے خوابناک انداز میں کہنا شروع کیا۔

''میری ماں کے انتقال کے بعد میری سوتیلی ماں نے میدان صاف دیکھ کر پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ سب سے پہلے اس نے میرے والد کو اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرنے کے لیے اکسایا۔ میرے والد نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ حلال کی کمائی کھاتے ہوئے گزار دیا تھا۔ وہ رشوت لینے کی ترغیب پر بھڑک گئے۔ گھر میں روز جھگڑا رہنے لگا۔ میری سوتیلی ماں گھر کے خرچ کے لیے روز پیسے مانگتی۔ جبکہ وہ پوری تنخواہ پہلی تاریخ ہی کو اس کے ہاتھ پر رکھ چکے ہوتے۔ جب وہ ڈائن ایک ہفتے میں ہی تنخواہ ختم ہونے کا ذکر کرتی' تو والد صاحب آگ بگولہ ہوجاتے۔ وہ میری ماں کا حوالہ دیتے کہ آخر وہ بھی تو چلاتی تھی گھر کا خرچ۔ میری ماں کا ذکر سنتے ہی قیامت ٹوٹ پڑتی اس ڈائن پر اس کے منہ میں جو بھی اول فول آتا' بک جاتی۔ شروع شروع میں تو بات زبانی تکرار تک محدود رہی پھر نوبت مار پیٹ تک پہنچی۔ وہ ڈائن میرے والد سے برابر ہاتھا پائی کرتی۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہتا کہ گھر میں دو بیٹیاں سن شعور کو پہنچ رہی

ہیں۔ بہرحال میرے والد نے سب کچھ برداشت کیا۔ لیکن رزق حلال کے دامن کو اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

میرے والد نے دوسری شادی کر کے جو عذاب مول لے لیا تھا' اس سے بچنا اب محال تھا۔ پچھتانا بھی بیکار تھا۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اول تو والد سے کبھی تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہ ملتا وہ ڈائن ہر وقت سر پر سوار رہتی تھی۔ کبھی موقع مل بھی جاتا' تو میں اپنے والد کی آنکھوں میں آنسو دیکھتی۔ ندامت اور پچھتاوے کے آنسو۔ میں چھوٹی ہو کر انہیں تسلی دیتی' تو وہ اور پھوٹ پڑتے۔ روز روز کے ان جھگڑوں نے ان کی صحت تباہ کر کے رکھ دی۔ میں انہیں دیکھتی تو دل ہی دل میں کڑھتی۔ میری اپنی حالت عجیب ہوگئی تھی۔ پے در پے محرومیوں نے میری شخصیت میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔ میں اکثر خالی الذہن رہتی۔ کبھی جاگتی آنکھوں میں خواب بسے ہوتے۔ کبھی انجانے واہموں میں گھری کپکپاتی رہتی۔ میرا بچپن اور آغاز جوانی انہی کانٹوں بھرے راستوں پر گزرا۔ بعض وقت تو عجیب جنونی سی کیفیت ہوجاتی۔ جی چاہتا کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاؤں۔ اس گھر میں اگر کہیں امید کی کرن موجود تھی' تو وہ ثروت تھی۔ ثروت میری دلجوئی کرتی۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آتی گئی۔ اسے اپنی سگی ماں سے نفرت تھی اور وہ نفرت کرنے میں حق بجانب تھی۔ میرے والد سے شادی سے پہلے کے جو واقعات اس نے اپنی ماں کے سنائے تھے وہ اچھے بھلے آدمی کے لیے عذاب سے کم نہ تھے۔

اس ڈائن کی عیاشیوں کی داستان بڑی طویل تھی۔ میرے والد سیدھے سادے تھے۔ اس کے جال میں پھنس گئے۔ جال میں پھنسنے کے بعد تمام تر اذیتیں برداشت کرنے کے باوجود انہوں نے آج تک جال کاٹنے کے بارے میں نہ سوچا تھا۔ ویسے شادی کے بعد بظاہر کوئی سکینڈل اس ڈائن کا ہمارے سامنے نہیں آیا۔ لیکن ثروت کو شبہ ہی رہتا' کیونکہ چور چوری سے جاتا ہے' ہیراپھیری سے باز نہیں

آتا۔ میں آپ کو ثروت کے بارے میں بتا رہی تھی کہ اس گھر میں وہ میرا واحد سہارا تھی اور اتفاق کی بات کہ وہ آج بھی میرا واحد سہارا ہے۔ ان دنوں ہم ایک چارپائی پر لیٹے رات گئے تک کھسر پھسر کرتے رہتے کہ اس ڈائن کی ڈانٹ سنائی دیتی اور ہم دل پر پتھر رکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے۔ ہم دونوں کے درمیان خلوص و محبت دیکھ کر اس ڈائن نے کئی بار ہمیں لڑانا چاہا۔ لیکن اس کی ہر کوشش ناکام رہی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا' گھر میں لڑائی جھگڑا بدستور جاری رہا۔

اب وہ میرے والد کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرنے لگی تھی اور میرے والد تھے کہ اس کی نازیبا حرکتیں بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کر جاتے۔ پھر وہ رات آئی' وہ بھیانک رات' جب میرے والد اچانک مجھ سے جدا ہو گئے۔ ابھی ہمیں سوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ میری سوتیلی ماں عرف ڈائن نے مجھے جگایا اور والد کی طبیعت خرابی کی اطلاع دی۔ شام تک تو وہ بالکل ٹھیک تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی' بھاگ کر دوسرے کمرے میں پہنچی تو میرے والد بستر پر نڈھال پڑے تھے۔ میں نے سر کے نیچے ایک اور تکیہ رکھ کر گردن اونچی کی۔ وہ غنودگی کے عالم میں تھے۔ میں نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا' تو انہوں نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور بڑے رقت آمیز لہجے میں بولے کہ ندرت مجھے معاف کر دینا۔ اتنا سننا تھا کہ میرا کلیجہ کٹ گیا۔ میں نے روتے ہوئے ان سے کہا کہ ابو آپ نیک اور شریف آدمی ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ سب کچھ تقدیر کا کیا دھرا ہے۔ میرا جواب سن کر انہوں نے کوشش کر کے ایک مرتبہ آنکھیں اور کھولیں' مجھے غور سے دیکھا۔ پھر ان کی آنکھیں خودبخود بند ہو گئیں۔ اچانک انہوں نے خون کی قے کی۔ اس قے سے پہلے خون کی دو قے اور ہو چکی تھیں۔ یہ تیسری قے سب سے بڑی اور آخری تھی۔

ان کی موت کے صدمے سے میں اپنے ہوش گنوا بیٹھی تھی۔ جب میں

ہوش میں آئی' تو میں نے اپنا سر کسی کی گود میں محسوس کیا۔ آنکھیں کھولیں تو ثروت کو اپنی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے پایا۔ میری ماں نے اس ڈائن کے بارے میں کہا تھا کہ یہ ٹونے ٹوٹکے والی عورت ہے۔ جب میرے والد کا اس طرح اچانک انتقال ہوا تو آس پڑوس کے لوگوں نے کالے جادو کا ذکر کیا۔ خود ثروت کا بھی یہی خیال تھا کہ میرے ولد کی موت کسی سفلی عمل کے سبب ہوئی۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔

لیکن اس بات کو ثابت کرنا آسان نہ تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ وقت نے مرہم بن کر میرے والد کی موت کو ذہن سے محو کر دیا۔

والد کی موت کے بعد اس ڈائن کا رویہ یکسر بدل گیا۔ وہ میرے ساتھ اچھی طرح پیش آنے لگی۔ والد کی زندگی میں تو وہ مجھ سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا نہ کرتی تھی۔ اس تبدیلی کے پیچھے کیا راز تھا' اس کا بھید کئی سال بعد کھلا۔ اب ڈائن کا گھر میں بہت کم وقت گزرتا تھا۔ میں نے اور ثروت نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ سلائی کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ تاکہ گھر کے اخراجات کسی طور پورے ہوں گھر چلانے کا کام ہم دونوں کے سپرد تھا اور وہ ڈائن ہمیں ہر ہفتے اس مد میں کچھ نہ کچھ رقم دیتی تھی۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا' اس کے بارے میں ہمیں صحیح طور پر علم نہ تھا۔ اب وہ باقاعدگی سے صبح گھر سے نکلتی اور شام کو لوٹتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ شام کو جاتی اور رات گئے واپس ہوتی۔ وہ کہاں جاتی تھی' اس کے بارے میں اس نے ہمیں کھل کر کچھ نہیں بتایا تھا' نہ ہی میں نے اس بات کی ضرورت سمجھی تھی کہ اس کے پیچھے بھاگی پھروں۔

ایک مرتبہ اس نے لاہور جانے کا ارادہ کیا ہمیں اس کے لاہور جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن اسے فکر تھی کہ ہم دونوں تنہا کیسے رہیں گے۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ وہ جہاں جانا چاہتی ہے جائے' ہماری فکر نہ کرے۔ ہمیں گھر

میں اکیلے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ ہم دونوں ابتدا ہی سے نڈر واقع ہوئے تھے۔ آج بھی آپ دیکھتے ہیں کہ اس گھر میں ہم دونوں تنہا ہی رہتے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔ خیر! وہ ہمارے مطمئن کرنے پر ایک ہفتے کے لیے لاہور چلی گئی۔ وہاں اس کے کچھ قریبی عزیز رشتہ دار تھے' جن سے ملنے وہ گئی تھی۔ وہ ایک ہفتے کے بجائے دس بارہ دن میں لاہور سے لوٹی۔ وہ خاصی خوش تھی۔ اس سفر نے اس کے چہرے کو بھی نکھار دیا تھا۔

لاہور سے واپسی پر اس نے مجھ پر خصوصی توجہ دینی شروع کی۔ میری ذرا ذرا بات کا خیال رکھنے لگی۔ مجھے کئی جوڑے کپڑے بنا کر دیئے۔ کچھ میک اپ کا سامان لا کر دیا۔ میں بتا چکی ہوں کہ وہ ڈائن نہایت شیریں زبان تھی۔ وہ آدمی کے پیٹ میں گھس کر بیٹھ جاتی تھی۔ اپنی چرب زبانی اور چکنے دار گفتگو سے ایسا سحر کرتی کہ آدمی یہی سمجھتا کہ اس سے بڑا خیر خواہ اس دنیا میں کوئی اور نہیں۔ مجھ پر بھی اس نے لفظوں کا جال پھینکا۔ ایسا سحر پھونکا کہ میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس پر ایمان لے آئی۔ میں میٹرک کا امتحان دے چکی تھی اور عمر کے اس حصے میں تھی جب آنکھوں پر رنگین عینک لگ جاتی ہے۔ دنیا کی ہر شے رنگین دکھائی دینے لگتی ہے۔ اب وہ ڈائن بڑے خلوص سے میری شادی کا ذکر کرنے لگی تھی کہ اپنی ندرت کے لیے ایسا لڑکا تلاش کروں گی' ویسا لڑکا تلاش کروں گی کہ میری بیٹی زندگی بھر عیش کرے گی۔ ایک دو بار وہ ہم دونوں کو باہر سیر کرانے اور فلم دکھانے کے لیے بھی لے گئی۔ اس ڈائن کی سگی بیٹی ثروت نے مجھے اپنی ماں کے اس رویے کی تبدیلی پر چوکنا رہنے کی تلقین بھی کی۔ لیکن میری آنکھوں پر پٹی بندھ چکی تھی۔ میں نے اس کی بات کو ہنس کر ٹال دیا۔

ایک شام کو اس نے ہم دونوں کو تیار ہونے کے لیے کہا۔ کلفٹن جانے کا پروگرام بنا۔ اس روز وہ کچھ بے چین سی تھی۔ وہ بار بار دروازے کی طرف جاتی'

دروازے سے باہر جھانکتی اور پھر مسکراتی ہوئی واپس آ جاتی۔ اس وقت میں نے اس کی اس حرکت کا کوئی نوٹس نہ لیا تھا۔ لیکن آج میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ دروازے پر یونہی نہیں جا رہی تھی۔ اسے کسی کا انتظار تھا۔ خیر! ہم لوگ تیار ہو کر باہر نکلنے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ ڈائن تیر کی طرح دروازے کی طرف بھاگی اور جب واپس آئی تو اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ وہ اس لڑکے کو لیے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے جلدی سے اپنا دوپٹہ درست کیا اور حیرت سے آنے والے کو دیکھنے لگی۔ تب اس ڈائن نے اس لڑکے کو اپنا کوئی دور کا رشتہ دار بتایا اور اس طرح ظاہر کیا' جیسے وہ اچانک ملنے آ گیا تھا۔ حالانکہ وہ باقاعدہ بلاوے پر آیا تھا اور اس ملاقات کا وقت بھی طے تھا۔ یہی لڑکا جس کا نام شاہد تھا' بعد میں میرا شوہر بنا اور اسی سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس دن مجھے دیکھنے آیا تھا اور یہ محض اتفاق نہ تھا' اس دن وہ بھی ہمارے ساتھ کلفٹن گیا۔ مجھے شاہد پہلی نظر میں ہی اچھا لگا۔ جب اس ڈائن نے اس سے میری شادی کا ذکر کیا' تو میں انکار نہ کر سکی۔ شرما کر گردن جھکا لی۔

شاہد ایک دواساز کمپنی میں سیلز مین تھا۔ اس کی آمدنی خاصی اچھی تھی۔ شکل وصورت کا اچھا تھا۔ شائستہ تھا۔ چوبیس پچیس سال عمر ہوگی اس کی۔ میری سوتیلی ماں کی عمر اس وقت پینتیس سال تھی۔ لیکن وہ شکل سے تیس سال کی لگتی تھی۔ جاذب نظر تھی۔ میک اپ کر لیتی تو پرکشش دکھائی دیتی۔ اس کا جسم خاص طور سے بہت اچھا تھا۔ سانچے میں ڈھلا۔ وہ بنیادی طور پر آوارہ مزاج عورت تھی۔ اس نے مجھے چارے کے طور پر استعمال کیا۔ اس مہارت سے کہ میں اس کی چال کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکی۔ میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی تھی لیکن اس ڈائن کے آگے میں زیادہ دلائل نہ دے سکی اور جلد ہی میں شاہد کی بیوی بن گئی۔ شاہد کے والدین نہ تھے۔ صرف دور پرے کے رشتہ دار تھے اور اس کی ملازمت ایسی تھی کہ اسے

پورے پاکستان کا دورہ کرنا پڑتا۔ اس کمپنی کا ہیڈ آفس بھی یہیں کراچی میں تھا۔ شادی کے بعد اس نے کوشش کر کے اپنی ڈیوٹی ہیڈ آفس میں لگوا لی۔ ہم لوگوں نے ایک فلیٹ لے لیا اور یوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگی۔

شاہد میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ بلکہ ضرورت سے زیادہ۔ اپنے شوہر کا ڈھیر سارا پیار پا کر کبھی کبھی میرے دل میں دھواں سا اٹھتا۔ میں انجانے اندیشوں میں کھو جاتی اور خوفزدہ ہوکر سوچنے لگتی کہ اے خدا! یہ سب کچھ عارضی ثابت نہ ہو۔ میں تقریباً روز ہی ثروت اور اپنی سوتیلی ماں سے ملنے جاتی۔ کبھی وہ لوگ بھی آ جاتے۔ میں نے کتنی بار اپنی سوتیلی ماں سے کہا کہ وہ ثروت کو لے کر میرے پاس آ جائے' لیکن اس نے میرے ساتھ رہنے سے صاف انکار کر دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ آج شاہد جتنی ان کی عزت کرتا ہے' ساتھ رہنے سے وہ ختم ہو جائے گی۔ پھر میں نے اصرار کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن ثروت کو میں اپنے ساتھ لے آتی تھی۔ وہ آٹھ دس دن میرے ساتھ رہتی' پھر اپنی ماں کے پاس چلی جاتی۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہوگیا میں نہایت مطمئن اور کامران زندگی گزار رہی تھی کہ زندگی کے خاموش سمندر میں ایک طوفان سا اٹھا اور سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ ان دنوں ثروت میرے پاس آٹھ دس دن سے رہ رہی تھی۔ شاہد آج کل رات گئے کام سے لوٹتا تھا۔ مہینے میں ایک آدھ ہفتہ ایسا ضرور آتا تھا کہ شاہد کو دفتر میں دیر تک کام کرنا پڑتا۔

ان دنوں ثروت کو اپنے پاس بلالیتی۔ مجھے تو اکیلے گھر میں ڈر نہیں لگتا تھا' لیکن شاہد مجھے اکیلے گھر میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب بھی اس کا اوور ٹائم لگتا' وہ ثروت سے جا کر کہہ دیتا تو وہ میرے پاس آ جاتی۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ میں اپنی مرضی سے اسے اپنے پاس بلالیتی تاکہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ آپی اپنے مقصد سے ہی اس کو بلاتی ہے' تو ثروت اس دن میرے پاس ہی تھی۔ شاہد دیر

سے آنے والا تھا۔ میرا اچانک فلم دیکھنے کا موڈ بنا۔ ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اس ڈائن کو بھی لے لیا جائے۔ اس لیے کہ وہ اس فلم کو دیکھنے کا ذکر کر چکی تھی۔ میں نے ثروت سے کہا کہ میں رکشہ میں جا کر اس ڈائن کو ساتھ لے آتی ہوں' پھر یہاں سے فلم دیکھنے چلیں گے۔ میں گھر سے نکلنے لگی تو ثروت نے مجھے ایک چابی دی اور کہا کہ ہوسکتا ہے کہ امی گھر پر نہ ہوں' آس پڑوس میں گئی ہوں' تو تم تالا کھول کر گھر میں بیٹھ جانا۔ مجھے اس بات کا خیال ہی نہ تھا کہ وہ محترمہ گھر میں ذرا کم ہی ٹکتی ہیں۔ خیر میں نے چابی لے کر پرس میں ڈال لی اور رکشا پکڑ کر وہاں پہنچی۔

گھر پر تالا پڑا ہوا تھا۔ پریشانی کی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے آرام سے تالا کھولا اور اندر گھر میں چلی گئی۔ صحن میں پہنچی تو مجھے شبہ ہوا کہ گھر میں کوئی موجود ہے۔ غسل خانے سے پانی گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی نہا رہا ہو۔ میں نے اس دروازے کی طرف نظر ڈالی' جو گندی گلی میں کھلتا تھا' تو اسے اندر سے بند پایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس ڈائن کو باہر سے تالا لگا کر گھر میں بیٹھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میں دبے قدموں سے اندر کمرے میں گئی۔ ذرا مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے سوچا کہ جب یہ ڈائن باہر نہا کر آئے گی' تو میں اسے ڈراؤں گی۔ اندر کمرے میں چارپائی پر چار پانچ کیسٹ ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ محترمہ گانے سنتے سنتے نہانے گھس گئی ہیں۔ ایک کیسٹ ٹیپ ریکارڈ میں بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے آواز بہت دھیمی کر کے ٹیپ آن کر دیا کہ ذرا دیکھوں تو کون سا گانا سنا جا رہا تھا۔ ٹیپ میں سے گانوں کے بجائے مکالموں کی آوازیں آئیں۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر سے کان لگا دیئے اور پھر مجھے دو منٹ یہ ٹیپ سننا دوبھر ہوگیا۔ میرا ذہن سنسنا اٹھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے کانوں میں کوئی بوند بوند تیزاب ٹپکا رہا ہو۔ میری آنکھوں سے اب ساری پٹیاں کھل گئی تھیں

اور میری سوتیلی ماں ڈائن کے روپ میں میرے سامنے کھڑی قہقہے لگا رہی تھی۔
میں نے وہ کیسٹ ٹیپ سے نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح دروازے کی طرف بڑھی۔

باہر نکل کر میں نے دروازے کو پھر سے تالا لگایا اور تیزی سے گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ رکشا میں بیٹھی تو میری حالت بڑی عجیب تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور میرا جی قہقہے لگانے کو چاہ رہا تھا۔ شاید میں ان لمحوں میں اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ بمشکل میں گھر پہنچی۔ ثروت کے دروازہ کھولتے ہی میں اس سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ پھر میں کھڑے کھڑے بے ہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ثروت کی گود میں پایا۔ مجھے فوراً ہی اپنے ابو کے انتقال کا خیال آیا۔ جب چاروں طرف نظر دوڑائی تو اس گھر کو دیکھ کر فوراً ہی تازہ حادثہ ذہن پر چھا گیا اور میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

میں نے اپنے حواسوں کو مجتمع کیا اور اسی وقت میں نے عہد کیا کہ اب میں نہیں روؤں گی اور حالات کا جان توڑ کر مقابلہ کروں گی۔ پھر میں نے اس کیسٹ کو اپنے ٹیپ میں لگا کر پورا سنا۔ اس ٹیپ کو سن کر ثروت کی بری حالت ہوگئی۔ وہ اپنی ماں کی وجہ سے جیسے خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ میں نے اسے سمجھایا اور آئندہ اپنے ارادوں سے اسے آگاہ کیا۔ اس گھر میں میرا رہنا اب محال تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اسی وقت اس گھر کو چھوڑ دوں گی اور زندگی بھر شاہد اور اس ڈائن کا چہرہ نہ دیکھوں گی۔ مسئلہ ثروت کا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ چلو میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ یہ سننا تھا کہ ثروت میرے قدموں میں گر پڑی۔ وہ اپنی سگی ماں کے ساتھ رہنے کو ہرگز تیار نہ تھی۔ لہٰذا میں نے اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کرلیا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا۔ شاہد کی طرف سے دیئے گئے کپڑے اور زیورات کو ہم نے

ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس کی کسی چیز کو نہ چھوا۔

پھر میں نے شاہد کے نام چند سطری خط لکھا کہ دنیا کے ذلیل ترین انسان! اگر تم میں ذرا بھی شرم باقی ہو تو اپنی ماں کے برابر محبوبہ کو اپنے ساتھ لے کر اس ملک سے نکل جاؤ تاکہ آئندہ میں تم لوگوں کی منحوس صورت نہ دیکھ سکوں۔ یہ خط میں نے ایش ٹرے کے نیچے میز پر رکھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں فوراً ہی شاہد کی نظر پڑ جاتی۔ پھر میں سب کچھ ہار کر ایک نئے عزم کے ساتھ گھر سے نکلی اور تالا بند کر کے چابی پڑوس میں دی کہ شاہد آئے تو اسے دے دی جائے اور ہم خالہ کے گھر منتقل ہوگئے۔ پھر میں نے اپنی ساری توجہ اپنا کیریئر بنانے میں صرف کردی۔ سب سے پہلے میں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ پھر بینک میں ملازمت مل جانے کے بعد بینک کے کئی امتحان پاس کیے اور اس طرح میں بینک افسر بن گئی۔''

''یہ وہی ٹیپ ہے؟'' میں نے ٹیپ ریکارڈر میں لگے ہوئے کیسٹ کی طرف اشارہ کیا جسے میں سن چکا تھا۔

''جی!'' ندرت نے مختصر سا جواب دیا۔

''سوال یہ ہے کہ ان دونوں نے اس قسم کی بے ہودہ گفتگو کا ٹیپ کس مقصد سے بھرا تھا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''میں نہیں جانتی۔'' ندرت نے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے یہ ٹیپ اسی ڈائن کی فرمائش پر بھرا گیا ہو۔ وہ تیسرے درجے کی عورت تھی۔''

''لیکن کیوں؟''

''تنہائی کاٹنے کے لیے۔'' ندرت نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔'' مجھے اس کے خیال سے اتفاق کرلینا پڑا۔

پھر صبح تک یہاں تک کہ مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس نے ان خبیثوں کے بارے میں بتایا کہ کوئی چھ ماہ

بعد وہ لاہور جاتے ہوئے ایک ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ اخبارات میں تصویریں چھپیں، تو ندرت نے مٹھائی تقسیم کی۔

اس کی باتیں سنتے سنتے میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں، تو میری حالت پر رحم کھاتے ہوئے بالآخر ندرت نے مجھے سونے کی اجازت دے دی۔ میں اس کے بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گیا اور ایک صوفے پر پڑ کر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

پھر جب میری آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر نہایا، دھویا اور ناشتہ کر کے دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

تب ندرت میرے قریب آئی اور اس نے وہ بات کی جس کا مطلب بقول آصف، شادی کی پیشکش تھا۔ لیکن میں نے اسے عام بات گردانا۔

اس نے میری ٹائی پر سے خیالی گرد جھاڑتے ہوئے کہا: ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ اس مکان میں منتقل ہوجائیں؟ دیکھیں نا، آپ وہاں اکیلے رہتے ہیں۔ کھانے پینے کی آپ کو کتنی دقت ہوتی ہوگی اور یہ ہوٹلوں کا کھانا تو اچھے بھلے آدمی کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ آپ کے یہاں آ جانے سے مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''اچھا.... میں اس مسئلے پر غور کرلوں، پھر آپ کو بتاؤں گا۔'' میں یہ کہہ کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ ''میں شام کو آؤں گا۔''

پھر میں تین دن تک اس کے گھر نہ جاسکا۔ دفتر پہنچتے ہی مجھے بخار ہوگیا۔ یہ رات بھر جاگنے کا نتیجہ تھا۔ نیند کا میں ہمیشہ سے کچا ہوں۔ نیند پوری نہ ہو تو نتیجہ اعصاب شکنی، سردرد اور بخار کی صورت میں نکلتا ہے۔

میں دفتر سے چھٹی لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ ایک لمحے کو یہ خیال بھی آیا کہ ندرت کے گھر چلا جاؤں، پھر یہ سوچ کر کہ اسے خواہ مخواہ میری وجہ سے زحمت اٹھانی پڑے گی۔ میں اپنے فلیٹ پر چلا گیا۔ پھر ایسا بیمار ہوا کہ تین دن سے پہلے

اپنے گھر سے نہ نکل سکا۔

چوتھے دن جب طبیعت ذرا سنبھلی تو میں نے سیدھا ندرت کے گھر کا رخ کیا۔ سوچا اس کے یہاں سے ہوتا ہوا دفتر چلا جاؤں گا۔ بیماری کے ان تین دنوں میں وہ مجھے برابر یاد آتی رہی۔ اب میں نے طے کرلیا تھا کہ اس کے گھر منتقل ہوجاؤں گا اور یہی بتانے میں اس کے گھر پہنچا تھا۔

جب میں اس کے گھر کے نزدیک پہنچا تو میں نے اس کے گیٹ پر ریچھ والے کو دیکھا۔ یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ یہ ندرت بھی خوب ہے، ریچھ کا تماشا دیکھنے میں لگی ہوئی تھی۔ جب میں نے اس کے دروازے پر رکشا روکا تو گیٹ کو بند پایا۔ ریچھ والا ایک ریچھ کو لیے گیٹ کے اندر جھانک رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے سلام کیا۔

''کیا معاملہ ہے، کیا بی بی جی نے تمہیں بلایا ہے؟'' میں نے ریچھ والے سے پوچھا۔

''صاحب جی! میں اپنا ریچھ لینے آیا ہوں۔''

''کیا مطلب''

''میں کل شام کو آیا تھا جی یہاں   بی بی جی نے ریچھ کا تماشا دیکھا اور پھر بولیں اس ریچھ کو آج میرے پاس چھوڑ جاؤ صبح آ کر لے جانا.. ''

''اوہ۔'' پھر ریچھ والا مجھے کچھ اور بھی بتاتا رہا، لیکن میں کچھ نہ سن پایا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

میں گیٹ پھلانگ کر اندر پہنچا، مکان کے دونوں دروازے اندر سے بند تھے۔ میں نے دونوں دروازوں کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اتنے میں ریچھ والا بھی اندر آ گیا تھا۔ اس نے بھی دروازہ بجایا، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

پھر میں بھاگ کر اس طرف پہنچا' جہاں ندرت کے بیڈروم کی کھڑکی کھلتی تھی۔ وہ کھڑکی بھی اندر سے بند تھی۔ میں نے اندر جھانکنے کی کوشش کی' لیکن کچھ نظر نہ آیا' کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

میں نے انتظار کیے بغیر کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ پھر پردہ ہٹا کر جب میں نے کھڑکی کا پٹ کھولا تو کوئی چیز بڑی تیزی سے اچھل کر میرے اوپر گری۔

وہ ریچھ تھا' جسے فوراً ہی ریچھ والے نے اپنے قابو میں لے لیا۔

میں کھڑکی سے کود کر اندر پہنچا تو کمرے کا منظر بڑا عبرتناک تھا۔ کمرے کی کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہ تھی۔ پورا کمرہ افراتفری کا شکار تھا۔ ندرت کی لاش بیڈ پر ترچھی پڑی تھی۔ اس کے جسم کا گوشت جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ لاش کے برابر ہی ایک لمبی سی خالی شہد کی شیشی پڑی تھی۔ ثروت کا گھر میں دور تک پتا نہ تھا اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اسے شام ہی کو خالہ کے گھر چھوڑ دیا تھا۔

کوئی انٹرویو لکھتے لکھتے آج بھی جب ندرت مجھے یاد آجاتی ہے' تو اس کے ہولناک انجام سے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور متضاد خیالات ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ اس کی موت کے بعد اپنے فوٹوگرافر ارشاد بھائی نے کہا تھا کہ دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ لڑکی فراڈ ہے' خواہشوں کی ماری' آخر دیکھ لیا اس کا انجام۔ لیکن آصف کا اس کی موت کے بارے میں بالکل مختلف خیال تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ندرت تم سے محبت کرنے لگی تھی اور وہ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے اپنی زندگی کے تمام راز تمہارے سامنے کھول دیے تھے۔ شادی کی واضح پیشکش کے باوجود جب تم تین دن تک اس کے گھر نہ پہنچے' تو اس نے اس بات کو اپنی توہین سمجھا اور انتقاماً اس نے ایک جانور پر اپنا پیار نچھاور کر دیا۔

(ختم شد)